الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۹۰۰

دائرہ حمیدیہ کی اعانت

دائرہ حمیدیہ کی خدمت و اعانت، کتاب الٰہی کی خدمت و اعانت ہے۔ اس کی تین صورتیں ہیں۔

۱۔ جو حضرات سو روپے یکمشت دائرہ کو عنایت فرمائیں گے وہ دائرہ کے معاون دائمی متصور ہوں گے ان کو دائرہ کا رسالہ "الاصلاح" اور تمام مطبوعات برابر ہدیۃً دی جائیں گی۔

۲۔ جو حضرات پچاس روپیہ یکمشت عنایت فرمائیں گے۔ ان کو رسالہ الاصلاح اور دائرہ کی دوسری مطبوعات برابر نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

۳۔ جو حضرات دس روپے سالانہ عنایت فرمائیں گے ان کی خدمت میں الاصلاح ہدیۃً جاری کیا جائے گا اور سال بھر کی مطبوعات بلا قیمت بھیجی جائیں گی۔

ہدایات و قواعد

۱۔ الاصلاح ہر انگریزی مہینہ کی پندرہ تک شایع ہوگا۔

۲۔ اگر مہینہ کے آخر تک پرچہ نہ پہنچے، فوراً دفتر کو لکھ کر منگوا لیجئے ورنہ بقیمت بھیجا جائے گا۔

۳۔ مضامین وغیرہ اڈیٹر کے نام بھیجئے اور دفتر سے متعلق امور کے لئے تمام خط و کتابت منیجر سے کیجئے۔

۴۔ دفتر سے خط و کتابت کرنے میں خریداروں کو نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے۔

۵۔ چندہ سالانہ چار روپے۔ بیرون ہند کے لئے چھ روپے۔ فی پرچہ چھ آنے۔

عبدالاحد اصلاحی منیجر دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظمگڈھ

عبدالاحد طابع و ناشر نے اصلاح پریس مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ میں چھاپ کر شایع کیا

دائرہ حمیدیہ کی اردو مطبوعات

تفسیر سورۂ اخلاص

استاذ امام علامہ فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر اردو میں لکھی ہے۔ اس سورۃ کی ہر دور میں بیشمار تفسیریں لکھی گئیں۔ لیکن اہل نظر نے اعتراف کیا ہے کہ علامہ فراہیؒ کی تفسیر میں جو نکتے بیان ہوئے ہیں۔ ان سے تمام تفسیریں خالی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ نہایت عمدہ۔ قیمت ۱-۵/

تفسیر سورۂ کوثر

استاذ امام علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ الکوثر کا اردو ترجمہ ہے۔ اسمیں کوثر کی تحقیق، خانہ کعبہ کی روحانی حقیقت اور نماز اور قربانی کے اسرار و حقائق پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اسکی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے کتابت و طباعت جاذب نظر کاغذ عمدہ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۲۳ صفحے قیمت ۸/

تفسیر سورۂ لہب

استاذ امام علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ اللہب کا اردو ترجمہ ہے۔ اسمیں عام خیال کی مدلل تردید کی گئی ہے کہ یہ سورہ بددعا ہے۔ ابولہب اور اس کی بیوی کے وجوہ ذکر نہایت اثر انگیز ہیں۔ اس تفسیر کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت و طباعت بہتر کاغذ نہایت عمدہ۔ حجم ۴۰ صفحے قیمت ۶/

منیجر

جلد ۳	ماہ محرم الحرام ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۳۸ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

شذرات	امین احسن اصلاحی	۱۲۹–۱۳۱
معارف قرآن		
تفسیر سورہ والمرسلٰت	استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ	۱۳۲–۱۴۳
ذبیح کون ہے؟	" " "	۱۴۴–۱۵۳
مقالات		
سیرت شبلی	جناب مولانا اقبال احمد صاحب سہیل ایم۔اے	۱۵۴–۱۶۲
کتبخانہ اسکندریہ اور حضرت عمر فاروقؓ	جناب مولوی عبد الرحمن صاحب ناصر	۱۶۳–۱۶۵
موعظۂ حسنہ		
بنیادی رذائل	جناب مولوی عزیز الرحمن صاحب اصلاحی	۱۶۶–۱۸۴
حکمت غرب		
مارکس اور لینن کے خیالات	جناب مولوی نیاز احمد صاحب صدیقی ایم۔اے	۱۸۵–۱۸۹
ادبیات		
غزل	جناب فراق گورکھپوری	۱۹۰
"	جناب دل شاہجہانپوری	۱۹۱

شذرات

آجکل بعض اخبارات و رسائل میں، مولانا حسین احمد صاحب کے ایک فقرہ کی بدولت، قوم اور ملت کے الفاظ پر ایک لغوی اور مذہبی و سیاسی مباحثہ شروع ہو گیا ہے۔ ناظرین نے شاید اس سلسلہ کے بعض مباحث پڑھے ہوں۔ حال میں اس پر علامہ اقبال کا ایک مفصل مضمون شائع ہوا ہے جو اس ذیل کا تازہ ترین فقہی شاہکار ہے اور قابل مطالعہ!

علامہ اقبال کے نزدیک اسلام ہیئت اجتماعیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئت اجتماعیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں۔ ان کے اس فتویٰ کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہماری ہیئت اجتماعیہ کے اصول اتنے بے لچک ہیں تو پھر ہندوستان میں مسلمانوں کو انگریزوں کے قدموں کے نیچے سے اٹھانے کی کیا شکل اختیار کی جائے؟ جو لوگ اس پامالی کو اسلام اور مسلمانوں کے لئے وجہ افتخار سمجھتے ہیں ان سے تو بحث نہیں مگر علامہ اقبال کو بتانا چاہیے کہ ہندوستان میں ہماری خلافت راشدہ کیسے قائم ہو؟ انگریزوں کی خوشامد کا تجربہ تو بہت ہو چکا، سر سید اور بک اور ماریسن کی روحیں ہم سے خوش ہوں گی کہ ہم نے کم از کم ہندوستان میں ان کے مشورہ کی قدر خدا اور رسول کے حکموں سے زیادہ کی۔ اب غالباً علامہ اقبال اس کا مشورہ تو نہ دیں گے۔ لیکن اگر انگریزوں سے جہاد کیا جائے تو ہندوستان کے ۲۲ کروڑ ہندوؤں سے کیا معاملہ کیا جائے؟ ظاہر ہے کہ اس خلافت راشدہ کے قیام کے جتنے دشمن انگریز ہیں اس سے زیادہ ہندو، پھر کیا ان دونوں سے ایک ساتھ [illegible] شروع کر دیا جائے؟ اگر یہ مصلحت کے خلاف ہے تو ہندوؤں کے ساتھ کس بنیاد پر معاملہ کیا جائے؟ علامہ اقبال کو سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بحث کا یہی پہلو متعین کرنا تھا، مگر انھوں نے سارا زور فرنگی نظریۂ وطنیت کی تردید میں صرف کر دیا اور اس بحث

ختم کر گئے، حالانکہ اگر وہ ہم کو کوئی ایسا راستہ بتا دیں جس سے ہم بغیر کسی الجھن کے سیدھے دلی کے تخت تک پہنچ جائیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم یہ راہ نہ اختیار کریں اور خواہ مخواہ کو اس وطنیت کے مسئلہ میں جھگڑے میں پڑیں۔ وہ ہمیں بس ایک یہی بات بتا کر ہمارے سب سے بڑے قومی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ سب سے بڑے ہادی اور مفتی بھی بن جائیں۔ ع ولیس علی اللہ بمستنکر ÷ ان یجمع العالم فی واحد

وہ لوگ بھی عجیب مخلوق ہیں جو یا تو دمشق کا تخت لیں گے یا پھر ہندوستان کی ذلیل غلامی۔ انگریزوں کی نوکری میں کروڑ نسلیں بھی گل جائیں گی مگر جب کبھی ان کو کسی وطنی معاملات میں ہندوؤں سے اتحاد کیجیے تو مجھ کو بھی بچانے کی کوشش کریں گے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اسلام ہیئت اجتماعیہ کے اصول میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا، اور مثال میں ابو لہب اور ابو جہل کے ساتھ اسلام کے طرز عمل کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ اس دین میں ایک واقعہ صلح حدیبیہ کا بھی پیش آیا تھا۔ مدینہ کے یہود وغیرہ سے آپ نے جو معاہدہ کیا وہ بھی معلوم ہے۔ پھر غیر مسلموں کی تمام جماعتوں کے ساتھ اسلام کا معاملہ یکساں نہیں۔ اہل کتاب کے لئے خود اسلام کے قانون میں رعایت تھی۔ اور مجوس و نصاریٰ کی بعض جماعتوں کے ساتھ شاید برتاؤ بھی اس سے بالکل مختلف معاملہ ہوا۔ پھر بعض جماعتوں کے ساتھ ان سے بھی مختلف شکل اختیار کر لی گئی۔ مثلاً نصاریٰ بنی تغلب جزیہ دینے میں ہتک سمجھتے تھے اس لئے وہ مجبوراً رومیوں کے پاس چلے گئے۔ حضرت عمرؓ سے عرض کیا گیا کہ یہ بڑے بہادر ہیں اور دشمن ان سے آپ کے خلاف فائدہ اٹھا سکتا ہے اور جزیہ دینے میں یہ ہتک سمجھتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ان کو واپس بلوا لیا اور جزیہ کے بجائے ان پر صدقہ عائد کر دیا۔ البتہ مقدار میں مسلمانوں کے لحاظ سے زیادہ۔ حالانکہ جزیہ میں اسلام کی تعلیمات بالکل بے لچک ہیں اور معلوم و مشہور۔

حبشہ کے معاملہ میں اور جو سلوک واقعہ مسلمانوں نے نجاشی کی وجہ سے کیا وہ بھی اس ذیل میں لحاظ کے قابل ہے۔

بعض لوگ سینہ پر صلیب کا نشان (انگوٹھی) لگانے میں بھی شاید کوئی عار نہ سمجھیں لیکن ہندوؤں و مسلمانوں کی مشترکہ مجالس کی بعض چھوٹی چھوٹی بے ضرر باتوں پر بھی اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہیں کہ گویا یہ غیرت دینی ہے اور اس کو اپنی دینداری سمجھتے ہیں، حالانکہ فاروق اعظم جیسا دینی معاملات میں متشدد شاید ہی کوئی ہوا ہو۔ وہ بھی اس قدر متشدد نہ تھے۔ شام کا واقعہ شاید سب کو معلوم ہو کہ آپ نکلے تو اپنی عادت کے مطابق اپنے سادہ لباس میں تھے۔ لوگ استقبال کو نکلے۔ آپ نے ابو عبیدہ کے کہنے کو ترک کیا۔ ابو عبیدہ نے عرض کیا کہ یہ آپ کا دستور ہے مگر یہاں کے لوگ دیکھیں گے تو بعض معاملات کے متعلق بدگمان ہو جائیں گے۔ آپ نے فرمایا تب کچھ حرج نہیں چھوڑ دو۔

یہ اس وقت کا حال تھا جب تمام مصالح و موانع با سانی ملحوظ کئے جا سکتے تھے اور کوئی وجہ نہ تھی کہ اسلام کی ہیئت اجتماعیہ کے نشو و نما پا سکیں لیکن ان کے پھلنے پھولنے کی تمنا شاید ہی پیدا ہو گئی ہیں کہ علمائے انکو جمع کر کے اصول و فروع مستنبط کئے جو ہماری کتابوں میں موجود ہیں اور بیانات کو فرض کا موقع نہیں۔ حضرت سید احمد بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید وغیرہ جیسے ان رموز سے بے خبر نہ تھے اور اسلامی سلطنت کے جاہ و جلال کا نقشہ انکی نظروں میں ہم سے زیادہ بسا ہوا تھا۔ تاہم جب سکھوں کے خلاف ان لوگوں نے جہاد کیا تو صاف کہا کہ ہمارا مقصد انکا ملک لینا نہیں ہے ہم دینی حالات میں مسلمانوں کیلئے آزادی چاہتے ہیں۔ یقیناً اگر یہی بات اسلام کی ہیئت اجتماعیہ کو نظر انداز کر دیا بلکہ بہت زیادہ جھکا دیا لیکن وہ جانتے تھے کہ حالات اس سے زیادہ کیلئے سازگار نہیں ہیں۔ اگر انھیں آرام کرسی پر بیٹھ کر فلسفہ بگھارنا ہوتا تو وہ بھی وہی کہتے جو علامہ اقبال نے فرمایا لیکن انھیں تلوار لیکر رزم گاہ میں جانا تھا اور مشکلات کو سامنے رکھ کر عمل اور اس وادی میں ایسے موڑ بہت سے آتے ہیں جہاں آدمی کو پیادہ ہونا پڑتا ہے۔

مولانا حسین احمد بھی ان ہی لوگوں میں ہیں، وہ صرف زندگی کے جمالیاتی پہلو کو دیکھنے والے شاعر نہیں ہیں بلکہ مجاہد فقیہ اور سیاسی ہیں اور جانتے ہیں کہ موجودہ مشکلات کے اندر مسلمانوں کو جتنا اٹھا سکتے ہیں اٹھا دیں اگر غلامی اور جاہلیت کا دور بھی ہو تو کم از کم مسلمان ملک کے اندر ایک با عزت اور خود دار قوم کی زندگی تو بسر کریں۔ یقیناً یہ تخیل خلافت راشدہ کے تخیل سے بہت کم ہے مگر اس غلامی کی دلدل سے بہر حال بہتر ہے جس میں ہم آج لوٹ رہے ہیں۔ نئی جمہوریت کم سے کم اس کی ضامن ہے کہ مسلمانوں کو مذہبی معاملات میں پوری آزادی حاصل ہو اور سیاسی و اقتصادی معاملات میں دوسروں کے ساتھ تحفظ مساوات، اور اگر مسلمانوں کا یہ تخیل تو وہ بھی انشاءاللہ ہٹ کا نہیں، علامہ اقبال کی شاعری و نمو کو گرمی دیگی اور کیا عجب کہ ہمیں ان کے تخیل کی اس عملی احیاء کے لئے بھی کوئی راہ پیدا ہو جائے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

علامہ اقبال کو اندیشہ ہے کہ قومیت اور وطنیت کے تصور سے اسلامی وحدت پارہ پارہ ہو جائیگی اور مسلمان لا مذہب و بے دین ہو جائیں گے۔ ممکن ہے کہ ان کے پاس ایسے دلائل موجود ہوں جن سے ان اندیشوں کی تصدیق ہوتی ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ وحدت اسلامی کس مرض کا نام ہے کہ جس کی بابت بعض کا وہ تصور رکھتے ہیں۔ اسلامی دنیا ایک طویل زمانہ سے "ذٰلک بلاد خلیفتہ و منبر" کی مصداق ہے۔ ادھر کچھ دن ہوئے ہیں سلطان عبدالحمید نے ایک صدا اٹھائی تھی لیکن اول تو وہ صدا بصحرا تھی ثانیاً محض اور یہ ایک محض فریب۔ اور علامہ اقبال غالباً اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس رشتہ کے توڑنے میں ہم کو کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ مغربی قوموں کی سازش سے ٹوٹا یا خود بخود، بہرحال ٹوٹ چکا۔ اب دوسرا ایک ذریعہ

یادگار کی حیثیت سے رہ گیا ہو اور اس کے ثمرات و نتائج بالکل مفقود ہیں۔ اگر آج بھی اعتصام کے تحریک کچھ زور ہو تو ہم اپنی مشکلات میں اس سے مدد لے سکیں لیکن جب یہ چیز آج موجود نہیں ہے تو ہم کیا کریں؟ اور افسوس ہے کہ جس طرح ہم کو اس کے توڑنے میں دخل نہیں اسی طرح موجودہ حالات کے لحاظ سے اس کے جوڑنے میں بھی کچھ دخل نہیں ہو سکتا۔ پس اس کے لئے ہم یہ تو کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ یوسف گم گشتہ واپس آجائے مگر نہیں کر سکتے کہ اس تخیل کیلئے اپنی تمام دوسری حرکت ترک کر دیں۔ اگر یہ محض عقیدہ کی قسم کی کوئی چیز ہوتی تو ہم اس کو عقیدہ کی حیثیت سے محفوظ رکھتے۔ مگر یہ ایک سیاسی و اجتماعی مصلحت تھی جو افسوس ہے کہ آج مفقود ہو چکی۔

پھر علامہ اقبال کا یہ خیال بھی ہم کو صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ قومی و وطنی عصبیت اسلامی وحدت کے منافی ہے۔ اسلامی وحدت قومی و وطنی عصبیتوں کے منافی نہیں بلکہ ان کو قائم رکھ کے ان کو باہم گرفتہ رکھتی ہے۔ تو قوموں اور جماعتوں کی اپنی اپنی عصبیت ایک حقیقت کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کا مٹانا تقریباً ناممکن ہے۔ اسلام کیا ابتدائی دور ہی میں جنگ میں سپاہ کو بستر میں تقسیم کیا تھا انہیں بھی امتیازات قائم رکھے گئے تھے مگر دینی وحدت کا نظام بنیان مرصوص کی طرح قائم رہا۔ اصل یہ ہے کہ اسلام نسل، وطن، قوم کسی چیز کا دشمن نہیں۔ صرف ان کی تنگ نظری اور تعدد و بدبختی کا دشمن ہے۔ اسلام ایک دین فطرت ہے وہ فطرت انسانی کی کسی چیز کا دشمن کیسے ہو سکتا ہے۔ البتہ وہ ضرور چاہتا ہے کہ انسان کی ان شعبوں کا ایک مرکز و محور ہو اور وہ دین اسلام کا رشتہ ہے۔ اگر نسلی اور وطنی عصبیت کی کوئی حقیقت نہ ہوتی تو حضور اور صحابہ قریش نہ فرماتے۔ یہ قوم کی نسلی اور وطنی عصبیت ایک اصل رشتہ ہے اس کے تحاضی و تناصر کا رنگ جہاں دینی اور سیاسی و اجتماعی نظام کا پہلا محرک ہی رہا ہو تو پہلی چیز دینی وحدت کا رشتہ اس کو دینی تو لیا اور جماعتوں سے جوڑا ہے اگر مسلمانوں نے یہ راز بھلا دیا ہوتا تو ملوکیت کا رنگ طبائع پر غالب آگیا ہوتا تو اسلامی تاریخ کی بہت سی طوائف الملوکیاں نہ برپا ہوتیں اور مسلمانوں کا اجتماعی رشتہ زیادہ مستحکم بنیاد پر قائم ہوتا۔ مگر ہوا یہ کہ ایک عصبیت تمام دنیا کی عصبیتوں پر حکمرانی کرنے کی خواہشمند ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد سر زمین پراگندگی اور عرب و عجم اور ترک و عرب کی خانہ جنگیاں برپا ہو گئیں اور قومیں اس وحدت کے خیال سے ایسا کھٹکنے لگیں کہ ان کو اس کے فوائد کا سمجھنا مشکل ہو گیا۔

یورپ میں بھی اتحاد صلیبی جنگوں کے زمانہ میں جو تھا مگر وہ کس طرح ٹوٹا؟ جرمن اور اسپین نے سب سے اتحاد کو توڑا نہ کہ تمام یورپ کو ایک عصبیت کا محکوم رکھنا چاہا اور دوسری عصبیتوں کا ہمیشہ اپنے زیر دست کیا نتیجہ یہ ہوا کہ قوموں نے اس غلبہ سے چھوٹنے کیلئے الگ الگ قومیتوں کو جگایا اور سیاسی تمانے کے برسر اقتدار آئے حالانکہ اگر دوسری عصبیتوں کو نگہداشت کر کے اور ان کو ایک مشترکہ رشتہ اتحاد قائم کیا جاتا تو یہ افتراق کبھی نہ پیدا ہوتی۔

جنگ عظیم کے زمانہ میں ترکوں کی مختلف ممالک اسلامیہ پر بالادستی تھی مغربی قوموں کی سازش ہی سے نہیں ہوئی بلکہ ایک طرف ترکوں کی گرفت بالکل ڈھیلی ہو چکی تھی، ثانیاً شام، عرب، عراق اور مصر پر ترکوں کا استیلا اسلامی وحدت کا استیلا نہ تھا، ترکی عصبیت کا استیلا تھا اور دوسری

عصبیتیں دوسری عصبیتوں کے استبدادات سے خود تباہ ہو جانے والی چیز ہے۔ اگر ترکوں نے ان عصبیتوں کو خود الگ الگ رہنے کا موقع دیا ہوتا اور تہران میں اسلامی وحدت کی اجتماعیت قائم کرتے تو ذہنی اسلام ازم کی صحیح شکل ہوتی۔ بہر حال اسلامی وحدت، فطری قومیت و وطنیت کے منافی نہیں بلکہ اس کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کیلئے اس کے سوا کوئی شکل ہی نہیں کہ قومی انفرادیت کو باقی رکھ کے یہ رشتہ قائم کیا جائے۔

پس اگر آج ہمارے سیاسی مصالح متقاضی ہیں کہ ہم سیاسی معاشی معاملات میں ہندوؤں سے وطنی قومی بنیادوں پر مصالحت کرلیں تو کیا ہم اس اسلامی رشتۂ وحدت سے الگ ہو جائیں گے، یہ ہماری انفرادیت کا پہلو ہے جس کو ہماری اسلامی وحدت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کیلئے ہمارا دامن بالکل خالی ہے۔

اس تصورِ الحاد کا جو اندیشہ علامہ اقبال نے ظاہر کیا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ علامہ اقبال ہم سے زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ یورپ میں الحاد کے پھیلنے کی تاریخ کیونکر ہے اور اس کے اسباب و وجوہ کیا ہیں؟ اصل یہ ہے کہ مسیحیت کو وہاں نے جس رنگ میں رنگ دیا تھا وہ رنگ حقیقت کی آنچ کو برداشت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ عقائد و معاملات مختلف تھے پھر اس نے اقتدار کی ہوس میں علم و تحقیق اور حکمت و سیاست کے ہر گوشہ کو تاریک رکھنے کی کوشش کی اور اس کیلئے خونریز اور خوفناک جرائم کا ارتکاب کیا اور جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے علامہ اقبال کی طرح اس نے بھی قوموں اور جماعتوں کو انکا جائز حق دینے سے انکار کیا۔ ان سب باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ میں مذہب ختم ہو گیا۔ اب اگر آپ لوگ بھی اور ارباب فقاہت کے یہی مظاہرے کرینگے کہ مسلمانوں کو سمجھائیں گے کہ ہم کسی سے مل نہیں سکتے، وہ پھر ان کو علماء کی ذات سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ بتائیں گے تو قدرتی طور پر یہاں بھی ہوگا اور اس کے قبیل کے لوگ پیدا ہوں گے جو دین کو ایک مصیبت سمجھ کر اس کی بیڑیاں توڑ دینا چاہیں گے، اور افسوس ہے کہ اس کے آثار شروع ہو گئے ہیں اور دنیا کا سوال کیا ہے؟ اور وطنیت کے تصور کی کیا ضرورت ہے؟ اگر آپ حضرات کی دعاؤں سے انگریزی حکومت کا زمانہ کچھ ممتد ہوا تو اس تصور کے بغیر آپ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم مسلمانوں کی ذہنیت کو مسخ کر دیگی۔

تعجب ہے کہ لوگ یورپ کے الحاد کا الزام اس کے نظریۂ وطنیت کو دیتے ہیں حالانکہ وطنیت میں اگر الحاد کا کوئی پہلو ہے تو یہی ہے کہ ایک ملک کی مختلف العقیدہ اور مختلف المذاہب جماعتیں باہم یکجہتی پیدا کرنیکے لئے ایک مشترک نظامِ زندگی اختیار کرنے پر مائل ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ان کو اپنی انفرادی مذہبی و دینی خصوصیات مٹانی پڑتی ہیں لیکن یورپ میں ہم عجیب صورتِ حال دیکھتے ہیں کہ وہاں

ہر قوم نے وطنیت کے الگ الگ بت بھی تراش لئے تاہم مختلف جماعتوں کا نسلی خون و رنگ باقی ہے جرمنی نے یہودیوں کے ساتھ اپنے ملک میں جو کچھ کیا اور اب اسٹریا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی شہادت ہے۔ البتہ مذہب کو دبنا پڑا اور اس کی وجہ وطنیت نہیں بلکہ سائنس اور بعض معاشرتی قوتوں کے بالمقابل مسیحیت کی شکست پانی اور اس کے قدیم جرائم ہیں۔ وطنیت کا جنون ترکوں پر بھی سوار ہے اور انھوں نے بھی مذہب کو خیرباد کہہ دیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ مذہب سے اعراض ان کی وطنیت کا نتیجہ نہیں ہے۔ ان کے ملک میں مختلف الادیان جماعتوں کا ایسا تشتت و تفرق موجود نہیں تھا جس کو دور کرنے کے لئے وہ مجبور ہوتے کہ مذہب کو خیرباد کہیں۔ صرف علماء کی تنگ نظری اور تنگ دلی اور وہاں کے شیخ الاسلاموں اور دینی پیشواؤں کی بے غیرتی اور ایک عام جمود نے ان کو نفس مذہب سے بدگمان کیا اور پھر وہ ہوا جس پر صرف افسوس کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ اگر آج بھی اسلام کی ہیئت اجتماعیہ کے تمام اصول و فروع کو قانون کی حیثیت سے اختیار کرلیں تو ان کی وطنیت اس میں کیا روک ہو سکتی ہے؟ اور اگر اپنی انفرادی عصبیت کو باقی رکھ کر اسلامی وحدت کے رکن بنیں تو ان کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے؟

ہندوستان کی نسبت علامہ اقبال نے جو اندیشہ ظاہر کیا ہے وہ ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے اسلئے کہ یہاں مختلف نسل اور مختلف الادیان جماعتوں کا بہت بڑا اکھاڑا ہے۔ پس ان میں یکجہتی کا تصور خواہ کسی بنیاد پر ہو قدرتی طور پر ایک ایسا رجحان پیدا کرتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ رجحان حدودِ مذہب تک متعدی ہو۔ لیکن علامہ اقبال اس امر کو بھول جاتے ہیں کہ انہی اندیشوں سے یہاں اس امر کی پوری کوشش ہو رہی ہے کہ مشترک حدود کے اندر صرف وہی معاملات آئیں جن کی علیحدگی ناممکن التصور ہے اور یہ بھی اس لئے کہ آج ہم مجبور ہیں کہ دو برائیوں میں سے اس کو اختیار کریں جو اہون ہے۔ اگر ہم انگریزی راج کو سایۂ خدا سمجھ بیٹھے رہیں تو ہمارا خدا حافظ ہے۔ ہم کو زمانہ کے رجحانات اور اپنی فطری ضروریات کے آگے سپر ڈال دینی پڑے گی۔ ہم فطرت کے مقتضیات کے آگے بند نہیں قائم کر سکتے۔ ہم کو بڑھتے ہوئے سیلاب کو خود راستہ دینا ہوگا ورنہ اگر سیلاب نے خود راستہ بنایا تو تمام دیوار کو پاش پاش کر دیگا۔ آج جو لوگ مغربی نظریۂ وطنیت کے داعی اور مذہب کے منکر ہیں وہ آنیوالے وقت کا پتہ دے رہے ہیں اور یقیناً ہماری غفلت کی پیداوار ہیں۔ ہم ان کو ان کا واجبی اور شرعی حق نہیں دے رہے ہیں اس لئے انھوں نے ہم سے سب کچھ مانگنا شروع کر دیا لیکن ہمیں خبر ہے کہ وہ مانگ رہے ہیں، مبادا کہ وہ وقت آ جائے جب وہ چھیننے لگیں۔ وذالک یوم عسیر۔

لیکن ان سب باتوں کو جانے دیجئے، علامہ اقبال نے اسلام کا جو نصب العین پیش کیا ہے، ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں وہ ہندوستان میں اس نصب العین کے حصول کا عملی پروگرام بتائیں۔ ظاہر ہے کہ ملک کی موجودہ جماعتوں میں سے کوئی جماعت اس کے لئے جد و جہد نہیں کر رہی ہے، کانگریس اس سے بعید ہے تو مسلم لیگ اس سے ابعد! علامہ اقبال آگے بڑھیں، راہ کھولیں اور ہم کو لے چلیں۔ پھر بد بخت ہے وہ مسلمان جو ہندوؤں کی طرف مڑ کے بھی دیکھے اور کانگریس کا نام بھی لے۔ یہ جو سودا کیا گیا ہے یہ تو مجبوریوں کا سودا ہے۔ غیر مشترک راہ پا لینے کے بعد ان وادیوں میں کون ٹھوکریں کھائیگا؟

اگر علامہ اقبال نے کوئی عملی پروگرام پیش کیا تو الاصلاح کی طرف سے باتباع حضرت علی کرم اللہ وجہہ یہ جواب ہے کہ گو ہماری پنڈلیاں کمزور ہیں، اگرچہ ہماری آنکھوں میں آشوب ہے تاہم تن و دم ورگ ان کے ساتھ ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے اس مضمون میں قرآن کی روشنی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ امر ہمارے لئے موجب اطمینان ہے۔ لیکن ان کے مضمون کے مختلف حصوں سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک اہم صورت حالات کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ وہ اسلام کی اولین جد و جہد کو حرف بحرف ہمارے اوپر انطباق دینا چاہتے ہیں حالانکہ آنحضرت کی قوم غلام نہ تھی۔ آزاد تھی۔ اگر آپ کی قوم کسی دوسری طاقت کی غلام ہوتی تو آپ کی جد و جہد کی پہلی منزل غالباً یہی ہوتی کہ قوم کو دشمن کی غلامی سے آزاد کریں، کیونکہ دین کی صحیح دعوت غلام قوم میں بار آور ہو سکتی۔ اور آج ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس صورت حالات میں کار و بار نبوت کے مراحل و مقامات کیا کیا ہوتے؟ حضرت موسیٰ کی زندگی کو ہم کو یہی سبق ملتا ہے۔ ان کو پہلا حکم یہی ہوا کہ اپنی قوم کو فرعونیوں کے پنجہ سے نکالو۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ موجودہ حالات کے اندر مسلمانوں کی کل دینی تنظیم و اصلاح کے متمنی ہیں ہم کو ان کی کامیابی میں شبہ ہے۔ سب سے پہلا حکم توحید اور نماز ہے لیکن اس نکتہ پر قوم کو مجتمع کر کے قوم کی تمام طاقت کو آزادی کی راہ میں ڈالدینا چاہئے۔ قرآن یہی سبق دیتا ہے۔ اور یہی حق ہے۔ وماذا بعد الحق الا الضلال۔

یہ چند حرف علامہ اقبال کے مضمون کے اصلی نتائج سے متعلق عرض کئے گئے ہیں۔ ان کی تفصیلات سے تعرض کی گنجائش نہیں۔ انھوں نے قوم وحدت کی لغوی تحقیقات پر بھی زور صرف کیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ وہ اس خارزار میں نہ الجھتے۔ یہ ان کے ذوق کی چیز نہیں ہے۔

معارف قرآن

تفسیر سورۂ مرسلات

۳

"تالیف استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی"

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۲۹) اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ (۳۰)
لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ (۳۱) اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ (۳۲) كَاَنَّهٗ
جِمٰلَتٌ صُفْرٌ (۳۳) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۳۴) هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ (۳۵)
وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ (۳۶) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۳۷) هٰذَا
يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ (۳۸) فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ (۳۹)
وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۴۰)

جس کے تم منکر تھے اس کی طرف چلو، تین طرف پھوٹنے والے سایہ میں چلو جس میں نہ چھاؤں ہے نہ لپٹ سے بچاؤ۔ گنبدوں کے برابر اس میں چنگاریاں اڑتی ہیں، زرد اونٹوں کی مانند، اس دن منکروں کی خرابی ہے۔ یہ وہ دن ہوگا کہ ان سے بات نہ نکلے گی، اور نہ اجازت ہوگی کہ معذرت کریں، اس دن منکروں کی خرابی ہے۔ یہ فیصلہ کا دن ہے، ہم نے تمھیں اور اگلوں کو جمع کیا، پھر اگر تمھارے پاس کوئی چال ہے تو ہم پر چلو، اس دن منکروں کی خرابی ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

(۲۹ - ۳۰)

[ظل ذی ثلث شعب] اس سے مراد دھوئیں کا سایہ ہے۔ آگ کے کسی بڑے الاؤ سے جب دھواں اٹھتا ہے، اس میں مختلف شاخیں پھوٹ نکلتی ہیں اور وہ بالکل سائبان کی طرح چھا لیتا ہے۔ اسکی تاویل آگے بیان ہوگی۔

[لاظلیل] یعنی سایہ کی ٹھنڈک سے بالکل خالی ہوگا۔ "ولا یغنی من اللھب" مگر اس کی توضیح کردی، ایک جگہ فرمایا ہے وظل من یحموم لا بارد و لا کریم اس میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ اوپر لفظ ظل (سایہ) سے جو وہم پیدا ہو رہا تھا اس نفی نے اس کا ازالہ کردیا۔

[انھا] یعنی وہ شعلے جو اس سایہ کے پیچھے ہیں

[کالقصر] مشہور قرأت سکون صاد کے ساتھ ہے۔ پس وہ قول ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے جو حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہے کہ اس سے اونٹوں کی گردنیں مراد ہیں اور یہ قَصَرَۃ کی جمع بمعنی اصل العنق ہے۔ اولاً تو بعد کا قافیہ (فاصلہ) اس سے ہم آہنگ نہیں ہوتا، ثانیاً قصرۃ گردن کی جڑ کو کہتے ہیں۔ یعنی یہ انسانی جسم میں ایک مخصوص جگہ کا نام ہے، کسی مستقل عضو کا نام نہیں ہے کہ اس سے شعلوں کو تشبیہ دیجائے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ قصرۃ کی جمع ہے قصرۃ بڑے درخت کی جڑ کو کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ قول بھی صحیح نہیں ہے۔ بعد کی تشبیہ اس سے مطابق نہیں ہوتی، پھر یہ دونوں لفظ قرآن کی زبان سے نامانوس ہیں اور کوئی قرینہ ایسا موجود نہیں جو ان کی توضیح کردے۔ باقی رہا لفظ قصر تو وہ قرآن میں بار بار آیا ہے پس ظاہر تاویل ہی ہمارے نزدیک قابل قبول ہے اور یہی ابن مسعودؓ سے مروی ہے۔

یہ تشبیہ شعلوں کے پھیلاؤ، ان کی بلندی اور رنگ میں ہے کیونکہ محل بالعموم بلند جگہوں پر تعمیر کئے جاتے ہیں اور دور سے ان کو دیکھو تو ان کا رنگ چمکتا ہوا نظر آئے گا اور اوپر کا رنگ نیچے کے رنگ سے مختلف

معلوم ہوگا۔ یہاں تشبیہ میں محلوں کی بڑائی کا پہلو مد نظر نہیں ہے بلکہ صرف ان کی وہ ہیئت پیش نظر ہے جو دور سے نظر آتی ہے۔ اہل عرب نے اس لفظ کو بطور مشبہ بہ دونوں صورتوں میں استعمال کیا ہے اور پیش نظر وہی پہلو ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔

عمرو بن کلثوم کہتا ہے:-

واعرضت الیمامۃ واشمخرت　　کاسیاف بایدی مصلتینا

اور یمامہ کی چوٹیاں سامنے سے ایسی ابھری نظر آتی ہیں جیسے تلواریں سونتنے والوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں۔

اس وجہ سے اونٹنی کو محل اور پل سے اکثر تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ عربی زبان میں اس قدر عام بات ہے کہ اس کے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بعد جمالۃ صفر سے جو تشبیہ دی ہے اس سے ہمارے دعوی پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

[کانہ جمالۃ صفر] ضمیر کا مرجع شرر ہے اور یہاں رعایت لفظ کی گئی ہے۔ شرر اسم صنف ہے اس لئے مذکر، مونث، واحد جمع سب کے لئے اس کا استعمال یکساں ہوتا ہے۔ یہاں جمع کے مفہوم میں ہے اور "جمالۃ صفر" سے تشبیہ اس کا ثبوت ہے جمالۃ زرد اونٹوں کی جماعت کو کہتے ہیں۔ یہ تشبیہ شعلوں اور چنگاریوں کے رنگ اور ان کی بڑائی دونوں کو ایک ہی ساتھ نمایاں کر رہی ہے 'صفر' (زردی) کی قید اس لئے لگائی ہے کہ دھوئیں کی آڑ سے شعلوں کا منظر ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔

ظل ذی ثلث شعب سے ایک لطیف نکتہ

ظل ذی ثلث شعب (تین طرف پھوٹنے والا سایہ) جہنم کو اس طرح مصور کر کے پیش کر رہا ہے گویا وہ کسی ہولناک جاندار چیز کی طرح کفار کی طرف لپکی ہوئی چلی آرہی ہے اور اس کا دھواں تین مختلف سمتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ قرآن مجید میں، دوسرے مقامات میں بھی جہنم کی تصویر کچھ اسی سے

ئی طلبی پیش کی گئی ہے۔ مثلاً

وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ	اور جنھوں نے قیامت کا انکار کیا ہم نے ان کیلئے
سَعِيْرًا اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍ	دوزخ تیار رکھی ہے جب انکو دور سے دیکھے گی
بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا	وہ اس کا زور شور سنیں گے۔

اس سے زیادہ واضح تصویر سورہ ق میں ہے۔

يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ	جس دن ہم پوچھیں گے جہنم سے کیا تو بھر گئی
وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ	اور وہ کہے گی کہ کیا اور ہے؟

دوسری جگہ فرمایا ہے۔

اِنَّهَا لَظٰى نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى تَدْعُوْا	بے شک وہ لپٹ ہے ادھیڑ لیگی سر کی کھال اور جس نے
مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى (معارج)	اعراض کیا اور سرگردانی کی ان کو کھینچ بلائے گی

یہاں ثلث شعب سے ظاہری مقصد صرف آگ کے ہیجان و اشتعال کو بتلانا ہے لیکن اگر اس پر غور کیجئے تو فکر و نظر کے لئے بھی اس میں کافی وسعت ہے۔

یہ معلوم ہے کہ کفر کی بنیادی خصلتیں تین ہیں۔ (۱) اللہ تعالیٰ سے غفلت (۲) مخلوق سے بے پروائی (۳) روزِ جزا کا انکار۔ ان امور کی تفصیل اپنے موقع سے گذر چکی ہے۔ یہاں زیادہ وسعت کے ساتھ اس پر بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم بعض شواہد کا حوالہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

ایک جگہ اہل جنت اور اہل جہنم کا ایک مکالمہ ان لفظوں میں مذکور ہوا ہے۔

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ، قَالُوْا لَمْ نَكُ	کون چیز تم کو دوزخ میں لائی، کہیں گے ہم نہ
مِنَ الْمُصَلِّيْنَ، وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ	نماز پڑھا کرتے تھے اور نہ مسکین کو کھانا کھلاتے تھے
الْمِسْكِيْنَ، وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ	جو لوگ بیہودہ بکواس کیا کرتے تھے ان کے ساتھ ہم بھی

وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ	بکواس کیا کرتے تھے اور جزا کے دن کا انکار کرتے تھے۔

اس آیت میں خوض سے مراد انکار قرآن ہے اور اس انکار کی اصل وجہ یہ تھی کہ قرآن روزِ جزا کی خبر دیتا ہے جس کو تسلیم کرنے کے لئے وہ ہرگز آمادہ نہ تھے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے۔

اَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ	سو جس نے سخاوت کی، اور ڈر چلا اور اچھی بات کو
بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى وَ	سچ مانا اس پر ہم سہج کردینگے آرام دینے والی اور
اَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ	جس نے بخالت اور بے پروائی کی اور اچھی بات کو
بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى	جھٹلایا اس پر سہج کردینگے مشکل میں ڈالنے والی

ان دونوں آیتوں کے مطالب پر پوری وسعت کے ساتھ غور کرو، ان سے کفار کی یہ تینوں بنیادی خصلتیں پوری طرح نمایاں ہوجائیں گی۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انہی تین خصلتوں کے مطابق جہنم سے عذاب کی تین شاخیں نمودار ہوکر ان کی طرف بڑھیں گی اور ان کو جالیں گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

اسی سے ملتی ہوئی تاویل حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہے۔

ابو عبداللہ جدلی راوی ہیں کہ "میں بیت المقدس میں آیا، دیکھا کہ عبادہ بن صامت، عبداللہ بن عمرو اور کعب احبار بیت المقدس میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ عبادہ نے کہا، جب قیامت کا دن آئے گا، اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک میدان میں جمع کرے گا یہاں تک کہ ایک ہی جگہ سے ان کو نگاہ دیکھ سکے گی اور داعی اپنی آواز سنا سکے گا۔ اور اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا آج کے دن ان کے منہ سے بات نہ نکلے گی یہ فیصلہ کا دن ہے، ہم نے تم کو اور تمہارے اگلوں کو جمع کیا ہے، پس اگر آج تمہارے پاس کوئی داؤ ہو تو ہمارے ساتھ کر دیکھو۔ آج کوئی متمرد اور سرکش شیطان مجھ سے نجات نہ پاسکے گا۔ اس کے بعد عبداللہ بن عمرو نے کہا کہ کتاب میں ہم پاتے ہیں کہ قیامت کے دن جہنم سے ایک گردن نمودار ہوگی اور جب وہ لوگوں کے سامنے آئے گی تو کہے گی اے لوگو! میں تین قسم کے لوگوں کے پا

یہ بھی کہتی ہوں جن کو میں اس سے زیادہ پہچانتی ہوں جتنا باپ اپنے بیٹے کو اور بھائی اپنے بھائی کو پہچانتا ہے۔ آج نہ کوئی چیز ان کو مجھ سے بچا سکتی اور نہ کوئی چیز چھپا سکتی۔ خدا کا شریک ٹھہرانے والے جبار و سرکش اور متمرد شیطان۔ فرمایا۔ پھر ان کو لپیٹ لے گی اور جہنم میں حساب سے چالیس سال پہلے ڈال دیگی (اخرجہ ابن حاتم)

مجھے خیال ہوتا ہے کہ یہاں عبداللہ بن عمرؓ نے جن تین جماعتوں کا ذکر فرمایا ہے وہ آیت ذیل سے اخذ کرکے فرمایا ہے۔

أَلْقِيَا فِي جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيدٍ	ڈال دو جہنم میں ہر ناشکرے سرکش، بھلائی سے روکنے
مَنَّاعٍ لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُرِيبٍ الَّذِي	والے، حد سے بڑھنے والے، شک میں پڑنے والے کو
جَعَلَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَأَلْقِيَاهُ	جس نے اللہ کے ساتھ دوسرا معبود ٹھہرایا ہے
فِي الْعَذَابِ الشَّدِيدِ	اس کو ڈال دو سخت عذاب میں۔

اور اگر اس پر تامل کرو تو وہی تین صفتیں تمہارے سامنے آئیں گی جو اوپر ہم نے بیان کی ہیں یعنی خلق خدا سے بے پروائی، آخرت کا انکار، خدا سے غفلت کیونکہ شرک درحقیقت غفلت ہی کا نتیجہ ہے۔

ان آیات کے نظم اور مواقع ترجیع پر ایک مجموعی نظر

۹۔ اوپر یہ بات گذر چکی ہے کہ یہاں خطاب کا اسلوب ایسا اختیار فرمایا ہے جس سے پردہ کی چیز بالکل نگاہوں کے سامنے آگئی ہے اور ظاہر ہے کہ تاثیر کے اعتبار سے یہ اسلوب نہایت اعلیٰ ہے۔ اور چونکہ یہ تاثیر کمال درجہ پر پیدا کرنی تھی اس لئے قیامت کی تصویر ایسی کھینچی جو مخاطب کے حواس پر پوری طرح چھا جائے۔ پھر اسی مناسبت سے ویل کا ذکر فرمایا اور یہاں آیت ویل کے محل نے خود اس مفہوم کو پوری طرح واضح کر دیا جو یہاں پیش نظر ہے۔ یعنی یہ عذاب جو اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ ان کیلئے بالکل تیار ہے، ان کے لئے نہایت خوفناک خرابیوں کا سبب ہوگا۔

شدت عذاب کے محسوس پہلو کی تصویر کے بعد اس کے اس پہلو کو بے نقاب کیا جس کا احساس ذہن کرے گا، یعنی عذر معذرت کی فرصت سے محرومی۔ اور یہ عذاب کی ظاہری ہولناکیوں کے بعد اس کا ایک باطنی تازیانہ ہوگا جو براہ راست دلوں پر لگے گا۔ چنانچہ اس کے بعد آیت ویل کو پھر دہرایا اور موقع کے مخصوص حالات کے لحاظ سے اس کا مفہوم پہلی آیت سے مختلف ہے جو اوپر بیان ہوا۔ یہاں یہ مفہوم ہے کہ اس دن ان کے لئے خرابی اور حسرت و نامرادی کے سوا کچھ نہ ہوگا، عذر و معذرت کے تمام دروازے بند ہوجائیں گے۔

ان ترہیبات کے بعد ان کو پھر ایک نئے انداز سے خطاب فرمایا۔ اس خطاب میں جھڑکی اور اسکات و تذلیل کا پہلو نمایاں ہے۔ اور دنیا میں معاد کا جو وہ انکار کرتے رہے ہیں اس کا بانداز تحقیر جواب ہے۔ اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

هَٰذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنتُم بِهَا تُكَذِّبُونَ	یہی وہ جہنم ہے جس کو تم انکار کرتے تھے،
أَفَسِحْرٌ هَٰذَا أَمْ أَنتُمْ لَا تُبْصِرُونَ	یہ جادو ہے یا تمہیں سوجھائی نہیں دیتا

اس خطاب میں اپنی قدرت کی بے پناہ وسعت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ ہم نے تمام اگلوں اور پچھلوں کو جمع کر لیا ہے۔ کوئی نہیں جو آج کے دن ہماری گرفت سے بچ رہا ہو۔ اس کے بعد پھر ایک خطاب نمودار ہوتا ہے جو غائب کو مخاطب کے سامنے مشہود کر دیتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ اس دن تمام تدبیریں اکارت ہو جائینگی کوئی داؤ کام نہ آئے گا۔ اور جس طرح اوپر یہ بیان فرمایا تھا کہ اس دن عذر و معذرت کی تمام راہیں بند ہو جائیں گی اسی طرح یہاں بیان فرمایا کہ اس دن نہ کوئی چال اور تدبیر کام آئیگی نہ کوئی طاقت و قوت کچھ نفع پہنچائے گی۔ اس میں گویا ایک مخفی تعریض ہوگی کہ دنیا میں ان کو اپنی تدبیروں اور قوتوں پر بڑا ناز تھا، پھر آج ان سے کام کیوں نہیں لیتے؟ اس مضمون کے بعد آیت ویل پھر نمودار ہو گئی۔ تو یہاں موقع کے لحاظ سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس دن ان کا کوئی داؤ کام نہ آئے گا، تمام تدبیریں دھری رہ جائیں گی۔ صرف تباہی اور ذلت و رسوائی نصیب ہوگی۔ یہ چالیس آیتیں تمام ڈراوے کی ہیں ان کے بعد حسب ترغیب و ترہیب کے اس عام اصول کے مطابق جس کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں بشارت کی آیتیں آئیں تاکہ سختی اور نرمی کی ایک معتدل حالت پیدا ہو۔ پس فرمایا۔ ان المتقین فی ظلال وعیون الآیۃ (باقی)

ذبیح کون ہے؟

۳

واقعہ ذبح تورات کے بیان کے مطابق

۴۔ واقعہ ذبح جس طرح یہود کے صحیفوں میں بیان ہوا ہے، پہلے ہم اسکو اسی صورت میں پیش کر دینا چاہتے ہیں اس کے بعد ان اصولوں کی روشنی میں، جو اوپر گذر چکے ہیں، اس پر تنقید کریں گے

کتاب پیدائش کا بائیسواں باب اسی واقعہ کے ذکر سے شروع ہوتا ہے لیکن اس باب کی حکایت سابق باب سے متصل ہے جس میں ابراہیم کے اس مسکن کا ذکر ہے جہاں وہ آباد تھے اور جہاں سے بیٹے کو لیکر قربانی کے لئے نکلے تھے۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ وہ بیر سبع میں پھرتے رہے۔ پھر ان کے پاس اس دیار کا بادشاہ آیا اور ان سے اس نے ایک معاہدہ کیا۔ پھر وہ اپنے سابق مستقر فلسطین کی طرف لوٹ گئے۔ واقعہ کے اخیر میں اشارۃً ان کے اس مسکن کا ذکر ہوا ہے جہاں سے نکلکر وہ قربانی کے مقام کی طرف گئے۔ ان امور کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد، اب اصل واقعہ کو پڑھو جو کتاب پیدائش میں بیان ہوا ہے۔

"ان باتوں کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اسے کہا اے ابرہام، اس نے کہا میں حاضر ہوں (۲) تب اس نے کہا کہ تو اپنے بیٹے اضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے، ساتھ لیکر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤنگا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا (۳) تب ابرہام نے صبح سویرے اٹھکر اپنے گدھے پر چار جامہ کسا اور اپنے ساتھ دو جوانوں اور اپنے بیٹے اضحاق کو لیا اور سوختنی قربانی کے لئے لکڑیاں چیریں اور اٹھکر

اس جگہ کو جو خدا نے اسے بتائی تھی روانہ ہوا (۴) تیسرے دن ابرہام نے نگاہ کی اور اس جگہ کو دور سے دیکھا (اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقام قربانی تک آنے اور قربانی کرنے کا ذکر ہے یہاں تک کہ خدا نے ان کو پکارا) پھر اس نے کہا کہ تو اپنا ہاتھ لڑکے پر نہ چلا اور نہ اس سے کچھ کر کیونکہ میں اب جان گیا کہ تو خدا سے ڈرتا ہے اس لئے کہ تو نے اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے مجھ سے دریغ نہ کیا (۱۲) اور ابرہام نے نگاہ کی اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے تھے، تب ابرہام نے جا کر اس مینڈھے کو پکڑا اور اپنے بیٹے کے بدلے سوختنی قربانی کے طور پر چڑھایا (۱۳) اور ابرہام نے (۱۴) اس مقام کا نام یہوواہ یری رکھا چنانچہ آج تک یہ کہاوت ہے کہ خداوند کے پہاڑ پر مہیا کیا جائے گا (۱۵) اور خداوند کے فرشتہ نے آسمان سے دوبارہ ابرہام کو پکارا اور کہا کہ (۱۶) خداوند فرماتا ہے چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا اس لئے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی کہ (۱۷) میں تجھے برکت پر برکت دونگا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کے مانند کر دوں گا اور تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی (۱۸) اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی (۱۹) تب ابرہام اپنے جوانوں کے پاس لوٹ گیا اور وہ اٹھے اور اکٹھے بیر سبع کو گئے اور ابرہام بیر سبع میں رہا۔"

اس کے بعد عبارت ہے "ان باتوں کے بعد یوں ہوا" لیکن اس میں واقعہ ذبح سے متعلق کوئی بات نہیں ہے اس لئے ہم نے اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔ البتہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس ہجرت کے متعلق دو اور روایتیں ہیں جو ہم آگے بیان کریں گے۔ اس فصل میں صرف یہ پیش نظر ہے کہ واقعہ کا منصوص حصہ اور وہ امور بیان کر دیئے جائیں جن سے واقعہ کی اصل حقیقت پر بحث ہو سکتی ہے۔ پس ان امور کو خاص طور پر سامنے رکھو۔

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قربانی سے پہلے اور قربانی کے بعد بیر سبع کو اپنا مسکن بنایا۔

۲۔ سرزمین موریا بیر سبع سے تین دن کی مسافت پر ہے۔

۳۔ موریا ہی وہ مقام ہے جہاں انھوں نے قربانی کی۔

۴۔ یہ مقام دور سے نظر آتا تھا۔

۵۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کی۔

۶۔ یہ بیٹا ان کو نہایت محبوب تھا۔

۷۔ مقام قربانی کے قریب جھاڑی تھی۔

۸۔ اکلوتے بیٹے کی قربانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو برکت دی۔

۹۔ اور ان کی اولاد کے وسیلہ سے زمین کی تمام قوموں کو برکت دینے کا وعدہ فرمایا۔

۱۰۔ ان کی نسل اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی۔

چونکہ تحریف کرنے والوں کو یہ گمان نہ تھا کہ ان امور کی مدد سے واقعہ کی اصل حقیقت بالکل بے نقاب ہو کے رہے گی اس واسطے انھوں نے ان کو ہاتھ نہیں لگایا اور یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے بچ رہے۔

عام پڑھنے والوں کو صرف ایک بات یہاں کھٹکے گی کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کا نام تصریح کے ساتھ آگیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات مطلق قابل اعتماد نہیں ہے...... ان کا نام یہود نے محض اتّو سے ڈالدیا ہے کہ یہ بات ان کی خواہشوں کے بالکل مطابق تھی۔ اس کے دلائل بے شمار ہیں جن میں سے بعض مذکورہ بالا بیان سے مستنبط ہیں اور بعض ان کے صحیفوں کے دوسرے مقامات سے ماخوذ ہیں اور اب ہم ان تمام دلائل کی تفصیل کرتے ہیں۔

پہلی دلیل

۱۔ یہ واضح ہے کہ جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام بیٹے کی قربانی کیلئے نکلے ہیں، ان کے ساتھ

حضرت اسحاق نہ تھے۔ صرف حضرت اسمٰعیلؑ تھے۔ وہی ان کے ساتھ رہتے تھے۔ جن لوگوں نے حضرت اسحاق کا نام یہاں ڈالدیا ہے وہ اس معاملہ کو نہ سمجھ سکے اور یہ چیز خود اس بات پر دلیل ہے کہ حضرت اسحاق کا نام اس موقع پر بعد کا اضافہ ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ واقعہ سے صاف واضح ہے کہ حضرت ابراہیمؑ بیٹے کی قربانی کے بعد بیر سبع ہی میں واپس آئے اور وہیں قیام کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیر سبع ان کا پہلے سے مسکن تھا۔ چنانچہ سابق باب میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اور واقعہ کی اصل حقیقت بھی یہی ہے۔ بیر سبع ہی وہ مقام ہے جہاں حضرت اسمٰعیلؑ اپنی والدہ کے ساتھ رہے۔ تورات میں جہاں حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ کو حضرت اسحاق اور ان کی والدہ سے علیحدہ کرنے کا واقعہ بیان ہوا ہے وہاں اس امر کی نہایت واضح تصریح موجود ہے۔ پس اس میں ذرا شک نہیں کہ اس واقعہ میں بہت کچھ جھوٹ کی آمیزش کردی گئی ہے اور چونکہ یہ جھوٹ تورات کی تصریحات سے بالکل خلاف تھا اس لئے علمائے یہود نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے لیکن اس کشف حقیقت کے باوجود حضرت اسحاق کا نام باقی رہ گیا۔ پس ہم اس جھوٹ کو نظر انداز کر کے ان کے اصلی اعترافات کو پکڑتے ہیں۔ کتاب پیدائش (۲۱: ۱۴) میں ہے

> "تب ابرہام نے صبح سویرے اٹھکر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور اسے ہاجرہ کو دیا بلکہ اسے اس کے کندھے پر دھر دیا، اور لڑکے کو بھی اس کے حوالہ کر کے رخصت کردیا۔ سو وہ چلی گئی اور بیر سبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی" (اس کے بعد پانی کے چک جانے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت ملنے اور دوبارہ پانی حاصل ہونے کا ذکر ہے اور پھر یہ عبارت ہے) "اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا۔
>
> اور وہ بڑا ہوا اور بیابان میں رہنے لگا"

اس عبارت میں 'بیابان' اور 'بیر سبع کا بیابان' کے الفاظ...... آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیر سبع کوئی آباد مقام نہ تھا، ایک بیابان تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس میں سات کوئے کھودے

اور درخت لگائے تھے۔ اس وجہ سے ابتدا میں اس کو "بیر سبع کا بیابان" کہنے لگے۔ یہ تسمیہ کا ایک عام اسلوب ہے جو ہر زبان میں موجود ہے۔ "مدینہ مصر" اور "جنات الفردوس" ہم عام طور پر بولتے ہیں۔ پس یہ دونوں کا نہ ہونا تھا کہ "بیابان بیر سبع" اس "بیر سبع" کے علاوہ کوئی مقام ہے جس میں حضرت ابراہیم رہا کرتے تھے۔ اس واقعہ میں اس کے علاوہ جو جھوٹ ملا دیئے گئے ہیں بروقت اس سے تعرض کی ضرورت نہیں۔ اس وقت ہم صرف مندرجہ ذیل نتائج تک پہنچنا چاہتے ہیں اور ان کے لئے راہ صاف ہو گئی ہے۔

۱۔ بیر سبع حضرت اسماعیلؑ اور ان کی ماں کا مسکن تھا۔

۲۔ یہ حضرت اسحٰقؑ اور ان کی والدہ کے مسکن سے دور تھا۔

۳۔ یہی حضرت ابراہیمؑ کا بھی مسکن ہوا۔ وہ یہیں سے قربانی کے لئے نکلے اور پھر قربانی کے بعد وہیں واپس آئے۔

حضرت سارہ کا مسکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مسکن سے دور تھا۔ اس کی ایک نہایت واضح دلیل یہ ہے کہ جس وقت حضرت سارہ بیمار ہوئیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے پاس موجود نہ تھے یہاں تک کہ جب انھوں نے ان کی موت کی خبر سنی تو ان کو وہاں سفر کرکے جانا پڑا۔ کتاب پیدائش (۲۳: ۲-۱) میں ہے

"اور سارہ نے قریت اربع میں وفات پائی۔ یہ کنعان میں ہے اور حبرون بھی کہلاتا ہے اور ابراہام سارہ کے لئے ماتم اور نوحہ کرنے وہاں گیا۔"

اس تفصیل سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ حضرت ابراہیمؑ جس صبح کو بیٹے کی قربانی کیلئے نکلے، انھوں نے حضرت اسمٰعیل کو ساتھ لیا جو بیر سبع میں انکے ساتھ موجود تھے کیونکہ اسی جگہ کو جو وہاں سے بہت دور حضرت سارہ کے ساتھ کنعان میں تھی۔ یہ بات ہم نے فرض کر کے کہی ہے کہ حضرت اسحٰق اسوقت پیدا ہو چکے تھے جیسا کہ علمائے یہود دعویٰ کرتے ہیں ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اسوقت تک حضرت اسحاقؑ پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کی ولادت واقعہ ذبح کے بعد ہوئی ہے۔ تفصیلات گیارہویں فصل میں آئیں گی۔

اس واقعہ میں یہ بات خود جھلکتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جس بیٹے کو قربان کیا اس کو قربان گاہ کے پاس ہی چھوڑ دیا نیز یہ بات ان کے اس قول سے بھی واضح ہوتی ہے جو انھوں نے حضرت اسحاقؑ کی ولادت کی بشارت سن کر فرمایا۔ انھوں نے فرمایا "کاش اسمٰعیل تیرے حضور زندہ رہے"۔ "تیرے حضور" کی اصطلاح کا مطلب حرف ح فصل ثانی میں سمجھ چکے ہو کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ "تیرے گھر کی خدمت میں مشغول رہے" اس بات کی تائید قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے۔ فرمایا

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ	پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے ایک
ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا	بن کھیتی کی زمین میں تیرے محترم گھر کے پاس
لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ	بسایا ہے۔ پروردگار تاکہ وہ نماز قائم کریں۔

یہ بیت اللہ کے جوار میں بسنے والے فرزند کون ہیں؟ یقیناً حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کیونکہ باتفاق فریقین یہ بات معلوم ہے کہ حضرت اسحٰقؑ اپنی والدہ کے ساتھ برابر کنعان میں رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود اپنے لئے ایک تیسری جگہ منتخب فرمائی جو حضرت اسحاقؑ کے مستقر اور حضرت اسمٰعیل کے مسکن کے بیچ میں تھی تاکہ وقتاً فوقتاً اپنی دونوں اولادوں کو دیکھ بھی سکیں اور بیت اللہ سے بھی قریب رہیں چنانچہ انکی وفات کے وقت ان کے دونوں بیٹے ان کے پاس موجود تھے۔ کتاب پیدائش (۲۵: ۹) میں ہے۔

"اور اس کو اس کے دونوں بیٹوں اسحٰقؑ اور اسمٰعیلؑ نے دفن کیا"

اسی طرح موضع ذبح سے بھی ہم اپنے دعویٰ پر استدلال کریں گے اور اس کی تفصیل آٹھویں فصل میں آئے گی۔

دوسری دلیل

۲۔ واقعہ ذبح کی تفصیلات میں، پڑھ چکے ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اکلوتے بیٹے کی قربانی کا

حکم ہوا تھا۔ اور اس میں ذرا شبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اکلوتے حضرت اسمٰعیلؑ ہیں کیونکہ وہ حضرت اسحٰقؑ سے ۱۴ برس بڑے ہیں۔ پیدائش (۱۶: ۱۶) میں ہے۔

اور جب ابرام سے ہاجرہ کے اسمٰعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا۔

پھر پیدائش (۲۱: ۵) میں ہے

"اور جب اس کا بیٹا اضحاق اس سے پیدا ہوا تو ابرہام سو برس کا تھا"

اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں۔

الف۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اکلوتی اولاد حضرت اسمٰعیلؑ تھے۔ یہاں تک کہ حضرت اسحٰقؑ پیدا ہوئے

(ب) اس اکلوتے بیٹے کی قربانی انھوں نے حضرت اسحاقؑ کی ولادت سے پہلے کی کیونکہ دوسرے بھائی کے پیدا ہو جانے کے بعد وہ اکلوتے نہیں رہے۔

یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر اس امر کی مستقل دلیل ہیں کہ ذبیح حضرت اسمٰعیلؑ ہیں۔ یہ امر اس قدر واضح ہے کہ کوئی شخص اس سے اختلاف کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مگر علمائے اہل کتاب نے خواہ مخواہ کو چکمہ مارا ہے کہ اس کے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ صرف حضرت اسحاق تھے اور حضرت اسمٰعیل بہت دور بھیج دیئے گئے تھے اس لئے اکلوتے حضرت اسحاقؑ ہی ہو گئے۔ گویا ان کے سوا حضرت ابراہیمؑ کے کوئی اولاد تھی ہی نہیں۔ حالانکہ اس جواب میں چند در چند اسقام ہیں۔

الف۔ اوپر پڑھ چکے ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے دور حضرت اسحاقؑ ہی تھے۔ حضرت اسمٰعیلؑ تو بیر سبع میں اپنے ماں باپ کے ساتھ تھے۔

ب۔ حضرت اسحاقؑ پر اکلوتے بیٹے کا اطلاق محض اس بنا پر ہرگز نہیں ہو سکتا کہ (یہود کے خیال کے مطابق) ان کے بڑے بھائی ان سے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے دور تھے۔ کسی شخص کا اکلوتا بیٹا وہی ہوگا جس کے ساتھ کوئی اور بیٹا اس کی محبت میں شریک نہ ہو۔ یہ ایک ایسی واضح بات ہے کہ جس میں

ذرا بھی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔

ج۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے علی سبیل التنزل ان لوگوں کی منطق تسلیم بھی کر لی جائے جب بھی "اکلوتے" کے لقب کے اصلی مستحق حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی ٹھہرتے ہیں کیونکہ وہ اپنے باپ کے مسکن سے ان لوگوں کے بیان کے مطابق دور اور تن تنہا تھے۔

پھر یہاں ایک اور لطف کی بات بھی ہے وہ یہ کہ ان لوگوں نے "ابنک وحیدک" (تیرا اکلوتا بیٹا) "بکرک" (تیرا پہلوٹھی کا بیٹا) کو تحریف کرکے بنایا ہے۔ یہ تحریف یقیناً کسی فائدے کے خیال سے کی گئی تھی لیکن اس سے وہ اور خسارہ میں رہے کیونکہ اس طرح وہ ایک دلیل سے بھاگے لیکن دو حجتیں ان کے گلے پڑیں اور علاوہ ازیں ایک ایسی حقیقت سامنے آگئی جس کے ظہور کا ان کو وہم و گمان بھی نہ تھا یعنی اس سے یہ نتیجہ بھی نکلا کہ حضرت اسمٰعیل حضرت اسحاق کی ولادت سے پہلے قربان کئے گئے ہوں۔ وللہ الحمد۔ گیارہویں فصل میں اس کی مزید تفصیلات آئیں گی۔

تیسری دلیل

اوپر پڑھ چکے ہو کہ جس بیٹے کو قربان کرنے کا حکم ہوا ہے اس کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ "وہ تجھے محبوب ہے"۔ اس سے بھی واضح ہے کہ حضرت اسمٰعیل ہی مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ صحف یہود میں ایسے دلائل موجود ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسمٰعیلؑ سے زیادہ محبت تھی۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

الف۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی ولادت کے لئے دعا فرمائی تھی۔ کتاب پیدائش (۱۵: ۲ تا ۴) میں ہے

"ابرام نے کہا اے خداوند خدا تو مجھے کیا دیگا؟ کیونکہ میں تو بے اولاد جاتا ہوں اور میرے گھر کا مختار دمشقی الیعزر ہے۔ پھر ابرام نے کہا دیکھ تو نے مجھے کوئی اولاد نہیں دی اور دیکھ میرا خانہ زاد میرا وارث ہوگا۔ تب خداوند کا کلام اس پر نازل ہوا اور اس نے فرمایا یہ تیرا وارث نہ ہوگا بلکہ وہ جو

"تیرے صلب سے پیدا ہوگا وہی تیرا وارث ہوگا۔"

جب اللہ تعالیٰ نے یہ محبوب اولاد ان کو بخشی اس کا نام انھوں نے اسمٰعیل رکھا جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے اس کی دعا سنی کتاب پیدائش (۱۶ - ۱۵) میں ہے۔

"اور ابرام سے ہاجرہ کے ایک بیٹا پیدا ہوا اور ابرام نے اس بیٹے کا نام جو ہاجرہ سے پیدا ہوا اسمٰعیل رکھا۔"

ذرا تصور کرو، ایک بڑا دردمند سوز و گداز انسان ہے جو بڑھاپے کی آخری منزل تک پہنچ چکا ہے لیکن اولاد کی نعمت سے محروم ہے۔ اس محرومی سے اس کا دل تنگ ہو رہا ہے اور وہ اپنے پروردگار سے اولاد کے لئے پرسوز دعا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرما کر اولاد کی نعمت سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی کرتا ہے۔ اس قبول دعا پر اس کے دل کا ریشہ ریشہ شکر کے جذبہ سے معمور ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اس کا نام ہی قبول دعا رکھ دیتا ہے۔ ۱۳ برس تک ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی پر محبت آغوش سے اسکو الگ نہیں کرتا۔ اکلوتا بیٹا ہے، دعائے سحر ہے، بڑھاپے کا چشم و چراغ ہے اور ایسی حالت میں کہ آئندہ اولاد کی امید نہیں۔ ان تمام باتوں کو سامنے رکھکر غور کرو کہ محبت اور محبوبیت کے اس عالم کا کوئی شخص صحیح اندازہ کر سکتا ہے!

ب۔ جس وقت حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحاقؑ کی ولادت کی بشارت ملی اس وقت بھی انھوں نے ایک ایسی بات فرمائی جس سے حضرت اسمٰعیل کے ساتھ ان کی بے پایاں محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس نعمت گراں مایہ کو پاکر دنیا کی تمام خواہشوں سے بالکل بے پروا ہو گئے تھے کتاب پیدائش (۱۷: ۱۸) میں ہے۔

"اور ابراہام نے خدا سے کہا کہ کاش اسمٰعیل ہی تیرے حضور جیتا رہے۔"

یہ فقرہ وہ اس وقت فرماتے ہیں جب ان کو ایک دوسرے بیٹے کی ولادت کی بشارت مل رہی ہے۔ اور پھر اس کی زندگی اور بقا کے لئے وسیلہ کیسا ڈھونڈتے ہیں؟ "تیرے حضور جیتا رہے"! اس فقرہ میں محبت کا جو امرت ہے اس کو کون جان سکتا ہے! جوش محبت کی بیتابیوں کا یہ عالم ہے کہ

اس کو چھپانے پر قادر نہیں۔ خدا کے حضور بھی اس کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ بھی اس بیٹے کا ذکر فرماتا ہے تو اس تعلق قلب کی طرف اشارہ فرماتا ہے۔ "وہ بیٹا جس سے تجھکو محبت ہے۔"

ج۔ حضرت سارہ نے جسوقت حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ خواہش کی کہ حضرت اسمٰعیلؑ حضرت اسحٰقؑ کے ساتھ وراثت میں حصہ نہ پائیں اور یہ کہ ان کو اور ان کی ماں کو نکال دیا جائے، حضرت ابراہیمؑ سخت رنجیدہ ہوئے۔ پیدائش (۲۱: ۱۱) میں ہے۔

"پر ابراہام کو اس کے بیٹے کے باعث یہ بات نہایت بری معلوم ہوئی۔"

اس سے واضح ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے کسقدر محبت تھی۔

(باقی)

تفسیر سورۂ فیل (اردو)

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفسیر سورہ فیل کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کی ہر فصل ایک مستقل کتاب ہے۔ واقعہ فیل کی اصل حقیقت اس کتاب کی اشاعت سے پہلے بالکل مجہول تھی۔ مولانا فراہیؒ نے کلام عرب کی مدد سے واقعہ کی تمام تفصیلات فراہم کرکے تمام تاریخی غلطیوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ واقعہ طیر کو بھی عجائب پرستی نے بالکل دوسرا رنگ دیدیا تھا۔ مولانا نے اس واقعہ کے متعلق بھی عینی شاہدوں کی شہادتیں جمع کرکے ان کی اصل حقیقت آشکارا کر دی ہے۔ اور اسی سلسلہ میں رمی جمرة اور دوسرے مراسم حج کے اسرار و حکم نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔

کتابت و طباعت بہترین، کاغذ عمدہ، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۱۲ صفحے قیمت ۸/

مینیجر

مقالات

سیرت شبلی

(۵)

بسلسلہ الاصلاح جلد ۲ نمبر ۱

از جناب مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم، اے

سیرت شبلی کا سلسلہ جو الاصلاح میں چھپنا شروع ہوا تھا مولانا سہیل کی بعض مشغولیتوں کی وجہ سے ملتوی ہو گیا تھا۔ اب وہ پھر اس کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کا قلم آخری منزل پر پہنچ کر رکے۔ (اڈیٹر)

روزانہ کی مستقل ہمنشینی نے علامہ مرحوم کو سرسید اور ان کی تحریکات پر بغور نگاہ ڈالنے اور ہر پہلو سے جانچنے کا کافی موقع دیا۔

دنیا کے اس وسیع تماشہ گاہ میں جیتے جاگتے انسان بھی سینما کی متحرک تصویروں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے اگر آپ چاہتے ہیں کہ کسی بڑی شخصیت کا رعب آپ پر قائم رہے تو غیر واضح معلومات کے دھندلکے میں دور کے ایک جلوے پر قناعت کیجئے، ورنہ جہاں آپ قریب پہنچے اور علم و بصیرت کی روشنی میں حقیقی خال و خط دیکھنے کی نوبت آگئی، وہاں سارا طلسم ٹوٹ جائے گا، اور توہم اور خوش اعتقادی نے جو خوشنما آئینہ خانہ تعمیر کر رکھا تھا اس کی بنیادیں ہل جائیں گی۔ وادیٔ ادراک کی یہی تلخیاں تو ہیں جن سے بعض اہل نظر بھی گھبراتے ہیں اور دیدہ و دانستہ فردوس بے خبری سے قدم باہر نکالنا نہیں چاہتے۔

بہرحال حقیقت یہ ہے کہ سرسید کی ذات گرامی انیسویں صدی عیسوی کے آخری نصف حصہ میں اسلامی ہند کی

سب سے زیادہ نمایاں شخصیت تھی۔ وسعت خلق، رفعت خیال، جودت فکر اور جرأت اظہار کے علاوہ قومی درد، سیاسی بصیرت، نسبی سیادت، اور ذاتی وجاہت نے ان کی نگاہ میں ایک مقناطیسی کشش پیدا کر دی تھی یہی جاذبیت تھی جس نے ان کے گرد بھی اکبر اعظم کی طرح ایک نورتن جمع کر رکھا تھا، اور یہی کہربائی اثر تھا جس کے آگے بڑی سے بڑی ہستیوں کو بھی سر نیاز خم کرنا پڑا، محسن الملک ہوں یا چراغ علی، حالی ہوں یا شبلی جو بھی سامنے آیا مسخر ہو کر رہا۔ سچ کہا ہے مولانا حالی نے۔

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں　　دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

سرسید کے تمام نامور حاشیہ نشینوں میں علامہ شبلی سب سے کم سن تھے اور تعلق بھی ملازمت کا تھا، اس لئے ان کا مسخر ہو جانا بظاہر سب سے زیادہ آسان تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ملاقات کے پہلے ہی وہ ایک حد تک مسخر ہو چکے تھے، علما کے طبقہ کو بالعموم جو مخالفت سرسید کی تحریک سے تھی اس کے اسباب یہاں بہت کم تھے، یہ مانا کہ مولانا فاروق تحریک جدید کے بڑے مخالفوں میں سے تھے، مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرسید نے اپنی تفسیر میں جو جدت طرازیاں کی ہیں وہ خود ان کے دل و دماغ کی پیداوار نہیں، بلکہ ان کا بیشتر حصہ مولانا فاروق کے بڑے بھائی مولانا عنایت رسول چریا کوٹی مرحوم کے خرمن کمال سے مستعار تھا، علاوہ بریں مولانا شبلی کا پورا خاندان سرسید کی تعلیمی تحریک سے متاثر ہو چکا تھا اور نفرت و بیگانگی نے عقیدت اور حسن ظن کی صورت اختیار کر لی تھی. جیسا کہ مولانا کے اس قصیدے سے صحیح ہوتا ہے۔ یہاں ہم مولانا کا پورا قصیدہ نقل کرتے ہیں جو مولانا نے سرسید کی خدمت میں پہلی ملاقات کے وقت پیش کیا تھا۔

قصیدہ

المجد یصحب علما حیثما یصل　　والعلم عن قومنا لا زال یرتحل

نالوا من الذل ما لا ناله احد　　اذ لا یری فیهم علم ولا عمل

ولا یزال یتشمت شملهم — فی کل یوم وقد ضاقت بهم حیل

لا یرغبون الی ما کان ینفعهم — فجل صنعهم اللغو والخطل

تراهم الیوم فی کاب فی قلق — فلا افاد فتیلا ما به اشتغلوا

لا ینتهون وقد ذاقوا وبالهم — عن سوء صنع فقد باؤا بما عملوا

وهل یجازیهم الا بما اکتسبوا — من کان من عنده الاحکام تنفصل

فمن سعی الیوم فی اصلاح حالهم — فالله جازیه یوما یقطع الامل

ان کنت تسئلنی من هکذا صفته — قلت الامام الهمام السید البطل

هو الذی فاق فی الآفاق منزلة — ونال ما لم ینله الاعصر الاول

من اقبل للدین والدنیا علیه معاً — والان فی نجح ما قد رامه مشتغل

نال المکارم من آبائه ومشی — فی المکرمات علی آثار ما فعلوا

فجده سید الاعراب والعجم — قد قال یا امتی بلادنا الاجل

وهکذا اصبح هذا السید العلم — یقول بالصدق قوم بئس ما عملوا

یا خیر من بسط حب القوم مرتبة — احسن ولا تنس من سوء ما عملوا

احسن الیهم ولو جازوک سیئة

ولا تبال بما قالوا وما فعلوا

جو لوگ علامہ شبلی کے افتاد مزاج سے کچھ بھی واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ خوشامد شبلی کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ اپنے ضمیر کے خلاف ایک حرف بھی کسی کی مدح وستائش میں لکھنے پر قادر نہ تھے۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ اس قصیدہ میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ دراصل شاعر کے ضمیر کی آواز ہے، جو نغمۂ موزوں بنکر نکلی ہے۔ اس پورے قصیدہ کو اول سے آخر تک پڑھ جایئے تو آپ کو خود محسوس

ہوگا کہ شاعر کی تمام زمزمہ سنجی کا سرچشمہ ملت محمدیہ کی موجودہ پستی کا دردناک احساس ہے جس سے شاعر خود بیتاب ہے اور اپنے ممدوح کو بھی اسی جوہر کمال کی بنا پر خراج تحسین کا مستحق قرار دیتا ہے۔

سرسید کے ساتھ روزانہ کے علمی اور سیاسی مذاکروں نے اس شعلہ کو اور بھی تیز کر دیا اور مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب وعلل پر علمی اور تاریخی حیثیت سے صرف توجہ کی ضرورت پیش آئی۔ علی گڑھ کی آزاد فضا میں علمی تگ و دو کے لئے ایک وسیع میدان ہاتھ آیا اور تحقیق وتفحص کی نئی شاہراہیں کھل گئیں۔ قوت آخذہ فطری تھی اور موقع خداداد۔ فرصت کافی تھی اور سرسید کے کتبخانہ میں نوادر کا اچھا ذخیرہ تھا۔ شوق مطالعہ کی سیری کے لئے حسن اتفاق سے ایک اور سامان ہوگیا۔ عبدالمجید نام کے ایک صاحب مولانا کے شناسا تھے جو ادھر ادھر سے نایاب کتابیں تلاش کر لاتے۔ اور مولانا کی خدمت میں تحفۃً پیش کرتے۔

ادھر جوں جوں مولانا کی غیر معمولی صلاحیتوں کے جوہر کھلتے جاتے سرسید کی گرویدگی بڑھتی جاتی ادھر خود اسٹیج کے اندر داخلہ کے بعد خود مولانا کی نگاہوں سے منظر کا رعب کم ہوتا گیا۔ اس طرح سید و شبلی روز بروز ایک دوسرے سے قریب ہو رہے تھے۔ مگر قرب کے ساتھ کشش اور کشش کے ساتھ کشمکش کا بڑھنا بھی قدرت کا عالمگیر اصول ہے۔

ادھر سرسید کو اپنی پختہ کاری اور جاذبیت پر اعتماد۔ ادھر علامہ شبلی کو اپنے علمی شرف اور فطری تفوق کا احساس۔ ادھر سمعاً وطاعۃً سننے کے لئے حسن طلب کے سیکڑوں اسلوب۔ ادھر دع ما کدر پر استقامت کے لئے حسن انکار کے ہزار پیرائے۔ ادھر نگاہ سحر فن ایک جوہر قابل کو ہمہ تن جذب کر لینے کے لئے بیتاب۔ ادھر فطرت خوددار کو اپنی انفرادیت برقرار رکھنے پر اصرار۔

عبث ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہو — نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

نصب العین دونوں کا ایک تھا یعنی ملت اسلامیہ کا احیا۔ علاج دونوں کی رائے میں ایک ہی تھا یعنی علوم جدیدہ کی تحصیل۔ اس منزل تک دونوں ہم آہنگ تھے۔ مگر آگے چل کر راستے جدا ہو جاتے تھے۔ سرسید مسلمانوں کے مستقبل کو یورپ کے حال میں رنگ دینا چاہتے تھے۔ اور علامہ شبلی یورپ کو خود اس کے اسلحے شکست دیکر اپنا ماضی واپس لانے کے آرزومند تھے۔ ایک کی مصلحت شناسی زمانہ کی رو کیساتھ بہہ چلنے کی خواہاں تھی تو دوسرے کی ہمت مردانہ خود اس رو کا رخ پھیر دینے کی متقاضی!

در میخانہ تک تو رند و محتسب دونوں ہمسفر ہو سکتے ہیں مگر ایک کو شکست توبہ کی دھن ہوتی ہے اور دوسرے کو شکست خم سے کام

خیر یہ لمبی داستان کسی دوسرے موقع کے لئے اٹھا رکھی جاتی ہے۔ یہاں کہنا صرف اسقدر ہے کہ علی گڈھ کے دوران قیام میں "کج دار و مریز" کی اس دماغی ورزش سے مولانا کے ذہنی ارتقا کو غیر معمولی مدد ملی۔ مولانا کی تربیت تمام تر مشرقی ماحول میں ہوئی تھی۔ اور علی گڑھ سراپا مغربیت کا داعی۔ مولانا نہ تو اتنے سریع الانفعال تھے کہ اس رو میں بہہ جائیں۔ نہ اتنے محروم الحس کہ گرد و پیش سے متاثر نہ ہوں۔ اس لئے نتیجہ وہی ہوا جو ان حالات میں ہونا چاہئے تھا۔ مشرق و مغرب کے دو برق بداماں بادل باہم ٹکرائے اور وہ بجلی چمکی جس سے مولانا کی تمام دماغی فضا دفعۃً جگمگا اٹھی۔

علی گڑھ آنے سے پہلے ہی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا۔ ایک دیوان فارسی زبان میں مرتب کر چکے تھے۔ عربی میں ایک رسالہ قرأت فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ پر حنفیت کی تائید میں شائع ہو چکا تھا۔ اور بھی چند رسائل مولوی سلامت اللہ صاحب جیراجپوری مرحوم کی تردید میں لکھے تھے مگر چونکہ ان کی زبان اردو تھی ایسلئے اپنے تلامذہ کے فرضی ناموں سے ان کو شائع کیا تھا۔ علی گڑھ کا پہلا احسان تو یہ ہے کہ عربی و فارسی کے بجائے اپنی اردو زبان کو ترقی دینے کا شوق پیدا کیا۔ اور غالب کے اس مشہور قطعہ میں جس خیال کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس کی غلطی محسوس کرائی۔

اے کہ گوئی کہ فلاں در شعر ہم سنگ من است   انچہ در گفتار فخر تست آن ننگ من است
فارسی بنگر کہ یابی نقش ہائے رنگ رنگ   بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

یہ خیال صرف غالب ہی کا نہ تھا۔ بلکہ اس زمانہ تک بالعموم تمام ذی علم حضرات اسی غلطی میں مبتلا تھے۔ اور تصنیف تو کیا خطوط میں بھی اردو کا استعمال ننگ سمجھتے تھے۔

بہر حال سرسید کے فیض صحبت اور فضائے علی گڑھ کی تاثیر سے مولانا کی توجہ اردو کی طرف مائل ہوئی۔ اور اس وقت سے بہ استثنائے شاعری ادب و انشا کا سارا زور اردو ہی پر صرف ہونے لگا۔ مگر باینہمہ سابق خیالات کا اتنا اثر تھا کہ سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں اردو نویسی کے لئے اعتذار کرنا پڑا۔ فرماتے ہیں:۔

گرچہ مرا شیوۂ فن این نہ بود   حرف بہ اردو زدن آئین نہ بود
پیشتر از گرم طلب بودہ ام   بادہ پیمائے عرب بودہ ام
بزم چو آں فرہ وآں ساز داشت   ساغر من بادہ شیراز داشت
لیک چو آں مطرب و ساقی نماند   بوئے ازاں میکدہ باقی نماند
بزم بطرز دگر آراستم   خوش ترازاں نیز کہ می خواستم
گرچہ سر و برگ سخن دیگر است   شمع ہمان است و لگن دیگر است
بادہ گوارا بہ عزیزاں تمام   بادۂ گلگوں بہ سفالینہ جام

دوسرا اور غالباً سب سے بڑا احسان علی گڑھ کا یہ تھا کہ مولانا کا موضوع تصنیف بدل گیا۔ اگر اسی قدیم ماحول میں رہتے تو درسیات کے شروح و حواشی یا فروعیات فقہی کے تنگ دائرہ سے نکلنا شاید نصیب ہوتا۔ یہاں آئے تو تاریخ اسلام کے ناپیدا کنار میدان میں تگ و دو کا ولولہ پیدا ہوا۔ مناظرانہ مذاق کے بدولت پہلے ان اعتراضات کے دفعیہ کی کوشش کی جو یورپ نے اسلام پر عائد کر رکھے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں کئی ایک

نادر تحقیقی مقالے لکھے۔ مثلاً الجزیہ، کتبخانہ اسکندریہ، مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم وغیرہ۔ مطالعہ کی وسعت سے تاریخ ارادوں کی رفعت اور حوصلوں کی بلندی بڑھتی گئی۔ حنفیت کے تعلق نے بحث و مناظرہ کے بجائے سیرۃ النعمان جیسے علمی شاہکار کی تصنیف پر آمادہ کیا۔ اسی زمانے میں اول اول تاریخ بلاد اسلامیہ کی تصنیف کا خیال پیدا ہوا۔ پھر معیار تصنیف کی دشواریوں پر نظر کرکے اس وسیع خاکے کو گھٹانا پڑا اور تاریخ بنی العباس کی طرح ڈالی۔ ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ معتصم کا حال لکھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ لیکن آخر اس کو بھی ترک کرنا پڑا۔ اور ہیروز آف اسلام کا تخیل دماغ کے سامنے آیا۔ اس سلسلۂ تصنیف کی پہلی کڑی المامون تھی جو اسی زمانہ میں تصنیف ہوئی۔ ان تاریخی تصنیفات کی ترتیب میں اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ یورپ کے انداز تحقیق اور اسلوب تحریر سے بھی استفادہ کیا جائے اور مشرقی طرز تصنیف پر یورپ کی جو نکتہ چینیاں ہیں ان کو سامنے رکھ کر تصنیفات کا وہ معیار قائم کیا جائے جس کو یورپ کے مستشرقین اور ایشیا کے متفرنجین بھی قدر کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہوں۔ اس مقصد کے پیش نظر یورپ کی ان دو زبانوں کا سیکھنا ضروری معلوم ہوا جو کیا بلحاظ وسعت استعمال اور کیا بلحاظ سرمایۂ علمی تمام السنۂ مغربیہ میں اس وقت ممتاز تھیں یعنی انگریزی اور فرنچ۔

مساعدت بخت نے اس کو بھی سامان مہیا کر دیا۔ پروفیسر آرنلڈ جو ان مشرقی زبانوں کے علاوہ پر ماہرانہ نگاہ رکھتے تھے، اور عربی و فارسی سیکھنے کے شائق تھے، ان سے معاملت ہوگئی۔ اور ان دونوں ارباب کمال نے ایک دوسرے کے سامنے زانوئے ادب تہ کر دیا۔ پروفیسر آرنلڈ مولانا سے عربی و فارسی کی تحصیل کرتے، اور مولانا ان سے انگریزی اور فرنچ سیکھتے۔ معمول یہ تھا کہ خود پروفیسر آرنلڈ شام کو مولانا کے بنگلے پر تشریف لیجاتے اور وہیں پر درس و تدریس اور افادہ و استفادہ کا سلسلہ چلتا۔

اس معمول میں کبھی فرق نہ پڑتا۔ پروفیسر آرنلڈ وقت مقررہ پر بلکہ ایک آدھ منٹ پہلے ہی پہنچ جاتے۔ ایک بار اتفاق سے چند منٹوں کی دیر ہو گئی مولانا کو اس کا احساس تک نہ ہوا مگر پروفیسر آرنلڈ نے آتے ہی

[illegible] شروع کر دی مولانا کو اس ذرا سی تاخیر پر آرنلڈ صاحب کا عذر خواہ ہونا بہت عجیب معلوم ہوا اور کہا کہ یہ محض رسمی تکلف ہے۔ لیکن پروفیسر آرنلڈ نے ان کو یقین دلایا کہ یورپ میں وقت کی عدم پابندی [illegible] اخلاقی عیب بلکہ قانونی جرم بھی سمجھی جاتی ہے اور ضیاع وقت کا ہرجہ بذریعہ عدالت وصول کیا جا سکتا ہے۔ [illegible] کی اس مسلسل اور ناقدانہ آمیزش نے پروفیسر آرنلڈ اور علامہ شبلی دونوں کو اپنی اپنی جگہ پر یگانۂ عصر بنا کر چھوڑا۔

ناسپاسی ہوگی اگر فضائے علی گڑھ کے اس فیض کو جس نے مولوی شبلی کو علامہ شبلی بنا دیا، فراموش کر دیا جائے۔ لیکن ناشناسی ہوگی اگر مولانا کے تمام علمی کمالات کا سرچشمہ علی گڑھ کو قرار دے دیا جائے۔ یوں سننے کو تو ہم بھی سنتے آئے ہیں کہ فلاں صاحب نے سنگریزے کو جلا دے کر نگینہ کر دیا۔ لیکن آج تک دیکھا نہیں کہ آب و ہوا کے فیض نے گیدڑ کو شیر نیستاں کر دکھایا ہو یا استاد کی تربیت نے کوے کو بلبل ہزار داستان بنا دیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی کے دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتیں فطرت کا عطیہ تھیں۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ذہن و اجتہاد کا ملکہ اور اخذ مطالب کی بے مثل قابلیت، شفیق اساتذہ کی تربیت اور اپنی محنت و دماغ سوزی کے ثمرات تھے۔ لیکن ان تمام فطری اور کتابی کمالات کو صحیح اور نتیجہ خیز منزل کی جانب [illegible] علی گڑھ۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ آج تک پھر علی گڑھ سے کوئی دوسرا شبلی نہ اٹھ سکا۔ علی گڑھ جس طول البلد اور عرض البلد پر پہلے تھا وہیں آج بھی ہے۔ البتہ اگر پہلے ایک [illegible] تھا تو [illegible] اگر پہلے ایک معمولی اسکول تھا تو آج خدا رکھے ایک وسیع یونیورسٹی ہے۔ عربی کے سیکڑوں فارغ التحصیل مولوی یہاں آئے اور پوری زندگیاں گزار دیں مگر آج تک اس کا کیا سبب ہے کہ جیسے تھے ویسے ہی رہے

ویسے ہی نہ پیسٹ گئے۔ علی گڑھ تنخواہیں بڑھا سکتا تھا بڑھا دیں، خطاب دلوا سکتا تھا دلوا دیے۔ مگر قیمتی بازار کا سودا نہ تھا۔ علی گڑھ خرید کر حوالے کر دیتا۔

مجھے یاد آتا ہے کہ علی گڑھ میں ایک بزرگ اپنے تہی مغز اور کور چشم معتقدین کو اپنے مخصوص رموزات اور اشارات سے یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ الفاروق دراصل انہیں کی تصنیف تھی مگر مسودہ سر سید کو دکھانے کے لئے دیا گیا وہاں سے سرقہ کر کے مولوی شبلی صاحب نے چھپوا دیا۔ مجھے یہ داستان انھیں کے خوش اعتقادوں میں سے ایک نے سنائی تو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ خیال ہوا کہ دنیا بھی کیسی فردوس الحمقا ہے جہاں بی، اے کلاس کے طلبہ بھی اس طرح کی بے سر و پا خرافات کو وحی آسمانی کی طرح باور کر لیتے ہیں۔ مجھے تو ان بزرگوار کی تہی مائگی پر افسوس ہے کہ ایک ہی سرقہ کے بعد ساری کائنات ختم ہو گئی اور ایک چیستاں نما ترجمہ کے سوا زبان قلم سے مدۃ العمر میں ایک حرف بھی تراوش نہ کر سکا۔ ادھر علامہ شبلی کی قسمت پر رشک ہو کہ قدرت ان کو برابر اس طرح کی دست برد میں امداد کرتی رہی اور الفاروق کے ماقبل و مابعد ہر زمانے میں کچھ لوگ ایسے مل جاتے تھے جو اپنے نتائج افکار کو اپنی غفلت سے ان کے دست تصرف تک پہونچا دیا کرتے۔

(باقی)

تفسیر سورہ کوثر (اردو)

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ الکوثر کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں کوثر کی تحقیق، خانہ کعبہ کی روحانی حقیقت اور نماز اور قربانی کے اسرار و حقائق پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

کتابت و طباعت جاذب نظر، کاغذ عمدہ، تقطیع $\frac{20\times 30}{16}$ حجم ۱۲۲ صفحے۔ قیمت ۸/

منیجر

کتبخانۂ اسکندریہ اور حضرت عمر فاروقؓ

از جناب مولوی عبد الرحمٰن صاحب ناصر

تاریخ میں کتبخانوں کے جلائے جانے کے بہت سے واقعات مذکور ہیں۔ مثلاً شہنشاہ تھیوڈوسیس نے ۳۹۱ء میں بت پرستوں کے تمام عبادت خانوں، ہیکلوں اور یادگاروں کو مٹا دیا اور اسی پر بس نہیں کیا، اپنے پورے احاطۂ سلطنت میں بت پرستی کے جتنے چھوٹے بڑے آثار پائے، سب صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیے، یہاں تک کہ اسکندریہ کا معبد سراپیوم منہدم کرا دیا اور اسی کے ساتھ اس کی تمام کتابیں اور نادر اشیا بھی برباد کر دیں۔

۶۵۶ھ میں ہلاکو تاتاری نے بغداد پر حملہ کیا۔ یہاں کے تمام کتبخانوں کی کتابیں نہر دجلہ میں ڈلوا دیں اور جو بچ رہیں ان کے بارہ میں حکم دیا کہ بجائے اینٹ اور مٹی کے انہی کو انبار کر کے گھوڑوں کے اصطبل اور بکریوں کے باڑے بنوا دیے جائیں[۱]۔

صلیبی جنگوں کے ایام میں، فرانسیسیوں نے جب طرابلس شام کو فتح کیا تو اپنے سپہ سالار کاونٹ برٹران ڈی سانگل کے ایماء سے وہاں کے تمام کتبخانوں کو نذر آتش کر دیا[۲]۔ اسی طرح جب اسپینیوں نے اندلس کو مسلمانوں کے ہاتھ سے چھینا تو وہاں کے تمام کتبخانوں کو برباد کر دیا۔

زمانۂ حاضر کی فرانسیسیوں جیسی متمدن قوم کا دامن بھی اس بدنما داغ سے محفوظ نہیں ہے۔ انھوں نے جب الجزائر فتح کیا تو شہر قسطنطنیہ کے کتبخانوں میں جتنی قلمی اور مطبوعہ کتابیں ان کو ملیں، انھوں نے سب نذر آتش کر دیں[۳]۔

---

[۱] تاریخ ابن الساعی ص ۲۰۷، و ابن خلدون ج ۳ ص ۵۴۳۔ [۲] تاریخ الامبراطوریۃ الرومانیۃ ج ۶ ص ۵۰۵ مصنفہ گبن۔ [۳] تاریخ العرب العام ج ۱ ص ۱۸۵، مصنفہ سیدیو۔

ان تاریخی شہادتوں کی موجودگی میں اگر تھوڑی دیر کیلئے یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ مسلمانوں نے حضرت عمر فاروقؓ کے حکم سے کتبخانہ اسکندریہ جلادیا۔ تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس مشہور روایتی اور تاریخی جرم میں شرکت کا دھبہ مسلمانوں کے دامن پر بھی ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے کسی ایسے جرم کا ارتکاب کیا ہے جو اس آسمان کے نیچے دنیا میں پہلی مرتبہ کیا گیا ہے۔

لیکن یہ کوئی چھوٹا جرم ہو یا بڑا۔ حفاظت دین کے جوش میں کیا گیا ہو یا محض ایک وحشت وبربریت کا ہولناک مظاہرہ ہو۔ اس بارہ میں اصل حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کی ذات اس الزام سے بالکل بری ہے۔ عربوں کے فتح مصر کے وقت، مکتبہ اسکندریہ کا وجود ہی نہیں باقی رہا تھا۔ وہ اس سے بہت پہلے جلایا جاچکا تھا۔

۳۲۳ قبل مسیحؑ میں جب سکندر مقدونی مرا اور اس نے تخت کا کوئی وارث نہ چھوڑا تو اس کی وسیع سلطنت اس کے فوجی افسروں نے آپس میں تقسیم کرلی۔ چنانچہ مصر بطلیموس سوتر کے حصہ میں آیا، جو اس مشہور خاندان بطالسہ کا بانی ہے جس نے مدتوں مصر پر حکومت کی۔

یہ افسر علم کا بڑا شایق تھا۔ مصنفین اور مولفین کی بڑی عزت کرتا تھا۔ خزانہ شاہی سے ان کے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ اس علم دوستی کی کشش نے تمام ملکوں کے علما اور فلاسفہ کو اسکے اردگرد جمع کردیا دنیا کے مختلف گوشوں کے علما اس کے سایہ عاطفت میں آرام کی زندگی گذارتے، اور علوم وفنون کی مختلف شاخوں میں بحث وتحقیق کی داد دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کے اندر اسکندریہ تمام علوم وفنون کا مرکز اور مامن بنگیا۔

انہی علما میں ایک یونانی ادیب دمتری فالیروس بھی تھا (شاید اسی کا نام عرب مورخین نے بگاڑ کے ذمیرہ کردیا ہے) اس نے بطلیموس سے ایک بڑا کتبخانہ قائم کرنے کی درخواست کی جس میں دنیا کی تمام علمی اور مذہبی کتابیں جمع کی جاسکیں اس نے خوشی کے ساتھ اس کی یہ درخواست منظور کرلی۔

اور فوراً ہی اس کام کی تکمیل میں سرگرم کار ہوگیا اور چند ہی سالوں کے اندر اندر بہترین کتابوں کی دسوں ہزار جلدیں فراہم ہوگئیں جن سے قصر شاہی کا ایک بڑا حصہ رک گیا۔

اس کے بعد بطلیموس ثانی جو بطلیموس فیلاڈلفوس کے نام سے مشہور ہوا، اس کا جانشین ہوا۔ اس نے بھی اس معاملہ میں اپنے پیشرو کے نقش قدم کی پیروی کی۔ بلکہ ایک کام اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کیا کہ بہت سے آدمی دنیا کے مختلف گوشوں میں بھیجے کہ نادر کتابیں تلاش کرکے اور خرید کرکے لائیں۔ چنانچہ چند ہی سالوں کے اندر ان آدمیوں نے یونانی، یہودی، آشوری اور فنیقی تالیفات اور ارسطو کے کتبخانہ کی تمام نوادر سے اس کتبخانہ کو معمور کردیا

اس کے بعد بطلیموس آرجنیس کا زمانہ آیا۔ اس نے تو گویا کتبخانہ کو زمین سے اچھال کر آسمان پر پہنچا دیا۔ اس کے عہد میں یہ عام حکم تھا کہ جو اہل قلم اسکندریہ میں قیام کریں یا وہاں سے گذریں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تصنیفات کا ایک ایک نسخہ کتبخانہ کو نذر کریں۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں کتابیں مکتبہ میں جمع ہوگئیں۔ اکثر مورخین کی رائے ہے کہ سات لاکھ کتابیں تھیں۔

۴۸ قبل مسیحؑ میں رومیوں نے مصر پر حملہ کیا۔ اسکندریہ کے باشندوں میں جولیس قیصر کے خلاف ایک سخت اشتعال پیدا تھا۔ اس کی وجہ ملکہ قلوپطرا سے اس کے ناجائز تعلقات کی شہرت تھی۔ چنانچہ باشندوں نے علم بغاوت بلند کردیا اور قصر شاہی کو گھیر لیا۔ قیصر نے، شاہی محل اور مصری بیڑے میں جو بندرگاہ میں لنگر انداز تھا۔ دونوں میں آگ لگا دینے کا حکم دیدیا تاکہ جب باغی اپنے بیڑے کے بچانے کی فکر میں مشغول ہوں تو اسے فرار ہونے کا موقع مل جائے۔ محل کی یہ آگ پھیلکر اس حصہ میں بھی پہنچ گئی جس میں کتبخانہ تھا، جس سے پورا کتبخانہ یا کم از کم اس کا اکثر حصہ جل کر خاک ہوگیا۔

اس کے بعد جب مسیحیت کا ظہور ہوا اور اس کے قدم مصر میں پہنچے۔ اور مصر رومن شاہنشاہی کا ایک جزو بنا تو قدرۃً ملک کی تمام علمی زندگی پر اس نئے مذہب کا رنگ چھا گیا۔ اور جس قدر نئے دین کے

نقوش ابھر جاتے اسی قدر قدیم علوم و فنون اور ان کے تمام آثار مٹتے جاتے۔

اوپر گذر چکا ہے کہ شہنشاہ تھیوڈوسیوس نے بت پرستوں کے تمام معبدوں، ان کے تمام ہیکلوں، ان کی تمام یادگاروں، ان کی تہذیب اور ان کے کلچر کی سب چیزوں کو اس طرح مٹا دیا کہ گویا انکا کوئی نقش لوح دنیا پر تھا ہی نہیں، اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ کتبخانہ اسکندریہ کی وہ بچی کچی کتابیں جو ۳۸۹ء میں جلنے سے محفوظ رہ گئی تھیں اور معبد سراپیوم میں ایک خاص جگہ محفوظ کر دی گئی تھیں وہ بھی اس متعصب شہنشاہ کے دست برد سے نہ بچ سکیں، اس نے کتابیں جلوا دیں اور معبد کو زمین برابر کرا دیا۔ کتنا...... عبرت انگیز واقعہ ہے! شاہان بطالسہ نے اتنی جانفشانیوں اور محنتوں کے بعد جو جواہر ریزے نہ جانے دنیا کے کن کن گوشوں سے جمع کئے وہ سب ایک آن میں آتش تعصب کی نذر ہوگئے۔

ان تمام واقعات کے بعد ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ۴۱۵ء میں ہیپا نیا نامی ایک عورت میں (جو اسکندریہ میں فلسفہ و ثنیت کی تنہا اور آخری عالمہ تھی) اور پوپ کیرلس اول بطریق شہر میں ایک مذہبی مناظرہ چھڑا۔ بطریق نے جب دیکھا کہ مناظرہ کسی طرح ختم ہوتا نظر نہیں آتا اور اس نے لوگوں کے دبے ہوئے جذبات پھر ابھار دیئے ہیں تو ہمیشہ کیلئے اس طرح کے مناظروں کو ختم کر دینے کیلئے اس نے اس آخری معبد کو بھی ڈھوا دیا جو بت پرستی کے دور کا آخری نشان رہ گیا تھا اور وہ کتابیں بھی تلاش کرکے جلوا دیں جو بعض لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر محفوظ رہ گئی تھیں۔

رومیوں نے صرف مصر ہی سے بت پرستی کے دور کے ہر نقش کو نہیں مٹایا بلکہ یونان سے بھی ان تمام چیزوں کا خاتمہ کر دیا جن میں وثنیت کے دور کی کوئی جھلک تھی۔ چنانچہ ایتھنز کے وہ تمام مدرسے جن میں فلسفہ و ثنیت کی تعلیم دی جاتی تھی یکقلم بند کر دیے گئے اور ان تمام کتابوں کے اوراق ایک ایک کرکے بکھیر دیے گئے جن میں تعلیم وثنیت کا شائبہ بھی پایا گیا۔

اب ان تمام غارتگریوں، بربادیوں اور آتشزدگیوں کے بعد کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ وہ کونسا

کتبخانہ اسکندریہ تھا جسے عمرو ابن العاصؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کے حکم سے جلایا تھا؟ اگر حضرت عمرؓ کے زمانہ حکومت میں اسکندریہ کے اندر کوئی کتبخانہ موجود نہیں تھا تو یہ شور و ہنگامہ کیا ہے جو بعض قدیم و جدید مورخین نے بپا رکھا ہے؟ آیئے جدید و قدیم تحقیقات کی روشنی میں بھی ہم اس افترا پردازی کی اصل حقیقت پر غور کریں۔

عربوں کے فتح مصر کے چھ صدی بعد تک کسی مورخ نے ذکر نہیں کیا کہ کتبخانہ اسکندریہ کو عمرو بن العاصؓ نے خود یا حضرت عمر فاروقؓ کے حکم سے جلوا دیا۔ ساتویں صدی میں ایک شخص پیدا ہوتا ہے جو یہودی النسل تھا پھر اس نے دین مسیحی اختیار کیا پھر ترقی کرکے کنیسہ کا بشپ بھی ہوگیا اس کا نام ابو الفرج ملطی تھا۔ اس نے سریانی زبان میں ایک کتاب لکھی۔ پھر اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام "مختصر تاریخ الدول" رکھا۔ اسی عربی نسخہ میں اس نے سریانی نسخہ کے علاوہ ایک جگہ تھوڑی سی عبارت بڑھا دی۔ جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

"عمرو بن العاصؓ کے اسکندریہ فتح کرنے کے وقت تک یحییٰ نحوی زندہ تھا۔ وہ عمرو بن العاصؓ کے پاس آیا اور اپنی لسانی فلسفیانہ گفتگو سے ان کو مسحور کر لیا۔ انھوں نے یحییٰ کو اپنے ساتھ کر لیا۔ ایک دن یحییٰ نے ان سے کہا کہ "اس وقت اسکندریہ آپکے زیر نگیں ہے۔ اب اس کی تمام چیزوں میں آپ کو تصرف کا حق حاصل ہے۔ جو چیزیں کہ آپکے فائدہ کی ہیں ان سے تو ہم کو مطلب نہیں مگر جو چیزیں آپکے لئے بیکار ہیں ان سے ہم کو مستفید ہونے کا موقع عنایت فرمایئے۔" انھوں نے کہا "وہ کیا چیزیں ہیں؟" یحییٰ نے کہا "حکمت و فلسفہ کی جو کتابیں شاہی خزانے میں محفوظ ہیں وہ ہمیں عنایت ہوں"۔ عمرو بن العاصؓ نے کہا "میں کوئی کام بغیر خلیفہ کی اجازت کے نہیں کر سکتا پہلے ان سے پوچھ لوں"۔ انھوں نے حضرت عمرؓ سے مشورہ طلب کیا۔ جواب میں حضرت عمرؓ نے یہ لکھا کہ "وہ کتابیں اگر کتاب اللہ کے موافق ہیں تو کتاب اللہ کے ہوتے ہوئے ان کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر کتاب اللہ کے مخالف ہیں تو ان سب کو جلوا دو۔" عمرو ابن العاصؓ نے یہ حکم پا کر تمام کتابیں، اسکندریہ کے مختلف

حماموں میں بھجوا دیں جو برابر چھ مہینہ تک جلتی رہیں۔ حضرت عمرؓ نے جب یہ سنا تو بہت خوش ہوئے"

بعض مورخین کا خیال ہے کہ اسی یحییٰ پادری نے یہ واقعہ گڑھا ہے تاکہ اس طرح وہ اسلام اور اسلام کے ان دونوں بزرگوں کی شہرت کو نقصان پہنچائے۔ مگر اس کی حقیقت کچھ اور معلوم ہوتی ہے۔ یہ واقعہ ابوالفرج نے خود نہیں گڑھا ہے بلکہ اس نے ابن القفطی کی کتاب "تراجم الحکماء" سے مذکورہ بالا عبارت اپنے عربی نسخہ میں نقل کی ہے۔ ابن القفطی کی کتاب کا اقتباس بھی ہدیہ ناظرین ہے۔

"عمرو بن العاص کے مصر اور اسکندریہ فتح کرنے کے وقت تک یحییٰ نحوی زندہ تھا۔ وہ عمرو بن العاص کے پاس آیا۔ ان پر اپنا علمی مرتبہ ظاہر کیا اور اس کے اور نصاریٰ کے درمیان جو مناظرے ہوئے تھے ان کا تذکرہ کیا۔ ابطال تثلیث اور انقضائے دھر پر اپنے دلائل بھی سنائے۔ ان سب باتوں نے عمرو بن العاص کو یحییٰ کا گرویدہ بنا دیا۔ انھوں نے اس کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ ایک دن یحییٰ نے ان سے کہا کہ "اس وقت اسکندریہ آپکے زیر نگیں ہے۔ آپ اس میں ہر طرح تصرف کر سکتے ہیں۔ جو چیزیں کہ آپکے فائدے کی ہیں ان سے تو ہم کو مطلب نہیں۔ مگر جو چیزیں آپکے لئے غیر مفید ہیں ان سے ہم کو مستفید ہونے کا موقع عنایت کیجئے۔" انھوں نے کہا "وہ کیا چیزیں ہیں؟" یحییٰ نے کہا کہ "شاہی خزانے میں حکمت و فلسفہ کی جو کتابیں محفوظ ہیں وہ آپکے لئے بالکل غیر مفید ہیں اور ہمارے لئے دولت گرانمایہ ہیں۔" انھوں نے پوچھا یہ کتابیں کس نے جمع کی تھیں؟ یحییٰ نے کہا "جب فیلاڈلفوس نے زمام حکومت اپنے ہاتھوں میں لی تو اطراف و جوانب کے تمام علماء سمٹ کر اس کے پاس آ گئے۔ اس نے بڑی محنت سے مفید کتابوں کے سراغ لگائے۔ اخراجات کے لئے شاہی خزانہ کھول دیا۔ ابن ذمیرۃ (دمتری فالیروس) کو خاص اسی کام پر مامور کیا۔ آہستہ آہستہ ان کتابوں میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ ہر نیا بادشاہ اس بارہ میں اپنے پیشرو کی تقلید کرتا" یہ سن کر وہ بہت متعجب ہوئے اور کہا "میں حضرت عمر فاروقؓ کی اجازت کے بغیر اس بارہ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ انھوں نے

حضرت عمرؓ سے مشورہ طلب کیا۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھ بھیجا۔ "وہ کتابیں اگر کتاب اللہ کے موافق ہوں تو کتاب اللہ کے ہوتے ہوئے ان کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر اس کے مخالف ہوں تو سب کو ضائع کر دو"۔ اس حکم کے بعد عمرو بن العاصؓ نے تمام کتابوں کو حماموں میں تقسیم کرا دیا جو چھ مہینہ تک جلتی رہیں۔ حضرت عمرؓ نے جب یہ سنا تو بہت خوش ہوئے۔"

ابوالفرج ملطی اور ابن القفطی دونوں کی عبارتیں بالکل مشابہ ہیں۔ ان کے دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ابوالفرج نے خود یہ جھوٹی روایت نہیں گڑھی ہے بلکہ اس نے ابن القفطی کی کتاب سے یہ روایت نقل کی ہے۔ تاہم ابوالفرج کی ذات کسی طرح اس الزام سے بری نہیں ہو سکتی کہ اس نے جھوٹی روایت محض اس لئے نقل کی کہ عمرو بن العاصؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے دامن عزت کو داغدار بنائے۔ ورنہ اگر وہ ایک مورخ کی حیثیت سے اس روایت کو جانچتا تو کبھی اس کو درخور اعتنا نہ خیال کرتا کیونکہ ابن القفطی اس روایت میں بالکل منفرد ہے۔ اس سے پہلے کسی مورخ نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اور نہ ابن القفطی کے ماخذ ہی کا پتہ ہے کہ اس نے یہ روایت کہاں سے نقل کی ہے۔

ان تفصیلات سے بالکل واضح ہو گیا کہ اس بیہودہ روایت کا گڑھنے والا ابن القفطی ہے۔ جرجی زیدان نے اپنی کتاب "تاریخ التمدن الاسلامی" میں ابن القفطی کی یہ روایت نقل کی ہے اور کوشش کی ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی تاریخی ماخذ بھی پیدا ہو جائے۔ تاکہ ابن القفطی اس اعتراض کی زد سے بچ جائے کہ اس کی روایت کا کوئی ماخذ نہیں ہے! اور متقدمین کی چند صدیوں کی طویل خاموشی کے بعد اس راز کا تنہا رازداں وہی ہے۔ چنانچہ جرجی زیدان لکھتا ہے کہ:۔ ابن القفطی نے یہ روایت عبداللطیف بغدادی کی کتاب "الافادۃ والاعتبار" سے نقل کی ہے جس نے بچشم خود مصر کے حالات کا معائنہ کیا تھا۔ اور اپنے بہت سے مشاہدات قلمبند کئے تھے۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے: بغدادی نے کتبخانہ اسکندریہ کا سرے سے کہیں ذکر ہی نہیں کیا۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل صرف اس قدر ہے۔

"میں نے بہت سے ستون دیکھے جن کے بعض حصے ابھی صحیح سالم تھے۔ اور بعض دست بُرد زمانہ کے نذر ہوچکے تھے۔ ظاہری صورت بتارہی تھی کہ ان ستونوں پر چھتیں ہوں گی۔ میرے خیال میں اسی میں وہ برآمدہ بھی تھا جس میں بیٹھ کر ارسطو تعلیم دیا کرتا تھا۔ اور یہی وہ دار العلوم ہے جو سکندر نے تعمیر کرایا تھا اور اسی میں وہ کتبخانہ بھی تھا جس کو عمرو بن العاصؓ نے حضرت عمرؓ کے حکم سے جلا دیا۔"

مگر اس اقتباس سے ابن القفطی کی روایت کے لئے کوئی مزید تائید نہیں فراہم کیجا سکتی اور نہ بغدادی کے اس قول پر کوئی تاریخی عمارت قائم ہوسکتی۔ گمان غالب یہ ہے کہ بغدادی نے خود تحقیق و تفتیش کی زحمت میں پڑنا نہیں چاہا اور بغیر کسی نقد و نظر کے یہ لغو روایت ابن القفطی کی کتاب سے نقل کردی ہے۔ یہ دونوں ہمعصر تھے۔

بہرکیف بغدادی کا ماخذ ابن القفطی ہو یا ابن القفطی کا ماخذ بغدادی۔ دونوں صورتوں میں جرجی زیدان یہ نہیں بتا سکتا کہ ان دونوں کا ماخذ کون ہے؟ اور نہ کسی اور دلیل تاریخی سے وہ اس کو مؤید کرسکا ہے۔ اس نے اس سوال کے جواب میں جو کچھ کہا ہے وہ محض ظن و تخمین ہے اور کوئی مورخ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کو باور نہیں کرسکتا۔ وہ کہتا ہے "لیکن بدقسمتی سے دوسرے تمام ماخذ (جن سے ابن القفطی اور بغدادی نے اخذ کیا) دوسری عربی تالیفات کے ساتھ ضائع ہوگئے"۔

اس سے اگر پوچھا جائے کہ اس کا کیا ثبوت کہ ان کے ماخذ تھے بھی جو دوسری تصنیفات کیساتھ ضائع ہوگئے تو اس کے جواب میں بجز خاموشی کے وہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جرجی زیدان اپنے دعوی کے ثبوت میں دوسری دلیل یہ بیان کرتا ہے۔

ابن الندیم نے اپنی کتاب "الفہرست" میں فلاسفۂ طبعیین کے سلسلہ میں کتبخانۂ اسکندریہ کے قیام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ منجملہ ان مصادر کے جن سے یہ روایت ماخوذ ہے۔ تاریخ کی ایک اور کتاب بھی ہے جس کے مصنف کا نام اسحٰق راہب ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں

یونان و روم کے حالات اور ان کے ادب اور لٹریچر سے بحث کی ہے۔ اور منجملہ ان باتوں کے جو لوگوں نے اس کتاب سے اخذ کی ہے، ذمیرہ کے ہاتھوں کتبخانۂ اسکندریہ کا قیام بھی ہے، اسکی اصل عبارت یہ ہے:

"اسکندریہ کے بادشاہوں میں سے بطلومائوس فیلاڈلفوس جب تخت نشین ہوا تو اس نے علمی کتابوں کی تفتیش شروع کی اور اس مہم پر ایک خاص شخص ذمیرہ نامی کو مامور کیا۔ اس نے اس کے لئے کتابیں فراہم کیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی تعداد چوبن ہزار ایک سو بیس تھی۔ اور اس نے بادشاہ سے کہا کہ ابھی ہند، سند، ایران، جرجان، ارمان، بابل، موصل، اور روم میں بیشمار نوادر کا ذخیرہ رہ گیا ہے۔" بعینہٖ یہی عبارت ابن القفطی کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن القفطی نے کتبخانۂ اسکندریہ کے قیام کا ذکر اسحاق راہب کی کتاب سے لیا ہے۔ اور اس کے جلنے کا واقعہ کسی اور سے۔"

لیکن "الفہرست" کی اس عبارت سے تو کسی طرح بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ عمرو ابن العاصؓ نے کتبخانۂ اسکندریہ جلایا تھا۔ اس سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ محض یہ ہے کہ اسحاق راہب کے نزدیک خاندان بطالسہ نے کتبخانۂ اسکندریہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ سو یہ ہر شخص کو تسلیم ہے۔ اختلاف صرف اس امر میں ہے کہ کتبخانہ کے جلانے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ اور اس مسئلہ کو ابن الندیم نے ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔ اور نہ اسحاق راہب نے اس سے کچھ تعرض کیا۔

اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم تسلیم بھی کرلیں کہ صرف ظواہر کو تاریخی تحقیقات میں دلیل راہ بنایا جا سکتا ہے۔ جب بھی جرجی زیدان سے یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ وہ جو یہ کہکر آگے بڑھ گیا ہے کہ "ابن القفطی نے کتبخانۂ اسکندریہ کے جلائے جانے کی روایت کسی اور سے لی ہے"۔ ہم پوچھتے ہیں یہ "کسی اور سے" کیا بلا ہے؟ اس کو کیسے معلوم کہ اس نے یہ روایت کسی اور سے لی ہے؟ اور وہ "کسی اور" کون ہے؟

عربوں نے دنیا کے گوشہ گوشہ سے کتابیں جمع کیں۔ ان کتابوں کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا اور ہر علم و تحقیق کی روشنی سے پوری دنیا کو منور کردیا۔ کیا ان عربوں کی بابت یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ علم و فن کے

ایسے دشمن تھے کہ جہاں کتبخانے پاتے ان کو جلا دیتے۔

حضرت عمرؓ اور حضرت عمرو ابن العاصؓ نے حکام مصر کے لئے جو دستور العمل بنایا تھا اس کے شروع میں یہ عبارت درج تھی۔

انما اعطیناهم العهد علی ان	ہم نے ان غیر مسلموں سے عہد کیا ہے کہ ہم ان کے
نخلی بینهم وبین کنائسهم	گرجاؤں کے معاملہ میں کوئی مداخلت نہ کریں گے وہ
یقولون فیها ما یشاؤن وان لا	ان میں جو چاہیں کریں۔ اور ہم ان پر ان کی طاقت
نحملهم ما لا یطیقون وان	سے زیادہ بوجھ نہ ڈالیں گے اور ہم ان کے قوانین
نخلی بینهم وبین احکامهم	کے باب میں بھی ان کو آزاد چھوڑ دیں گے مگر یہ کہ وہ
الا ان یاتونا راضین فنحکم	از خود راضی خوشی اپنے معاملات ہمارے پاس لائیں
بینهم	ایسی صورت میں ہم ان کے معاملہ کو چکا دیں گے۔

کیا کسی طرح یہ بات قیاس میں آسکتی ہے کہ جنھوں نے دوسرے مذہب والوں کو ان کے عقائد، ان کے خیالات، ان کے احکامات اور ان کے گرجوں کے بارہ میں یہ آزادی دی ہو وہی لوگ ان کے کتبخانوں اور ان کے علوم و فنون کی یادگاروں کو اس بے دردی کے ساتھ برباد کر دیتے!

آخر میں یہ بات بھی غور کرنے کے لائق ہے کہ عمرو بن العاصؓ نے مفتوح قوم کو گیارہ مہینے کی مہلت دی کہ وہ اس اثنا میں اپنا جتنا مال و متاع اور اپنی جتنی چیزیں اسکندریہ سے لے جا کر کہیں محفوظ کرنا چاہے محفوظ کرلے اور اس پوری مدت میں سمندر کا راستہ ان کے لئے کھلا رہا اور ان کی آمد و رفت پر کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ پھر بفرض محال اگر کتبخانہ اسکندریہ کا اس وقت کوئی وجود تھا تو کیا رومیوں نے اتنا اچھا موقع پانے کے باوجود کتبخانہ کی کتابیں کہیں منتقل نہ کر دی ہوں گی۔

پھر معاملہ کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو یہ کہ جب حضرت عمرو بن العاصؓ نے کتبخانہ کو اس خوف سے

جلانا چاہا کہ مبادا اس کا زہر مسلمانوں کے دین و ایمان کو خراب کر دے تو اس کا یہ کیا طریقہ تھا کہ کتبخانہ کی کتابیں حماموں میں تقسیم کر دیجائیں کہ ان کے جلنے میں چھ مہینے کی وسیع مدت صرف ہو کسی فتنہ کے مٹانے کا یہ تو کوئی محتاط اور کامیاب طریقہ نہ ہوا۔ وہیں کتبخانہ کے اندر یا کسی اور جگہ تمام ذخیرہ کو جمع کر کے آگ لگا دیتے، قصہ پاک تھا۔ نہ چھ ماہ کی وسیع مدت صرف ہوتی اور نہ ایک کتاب کسی کے ہاتھ لگ سکتی۔ حضرت عمرو بن العاص نے جو شکل اختیار کی اس میں تو نہ جانے کتنی کتابیں چوری گئی ہوں گی حالانکہ یہ بات ان کے مدعا کے بالکل خلاف تھی۔

مذکورہ بالا باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ابن القفطی کی روایت ایک کذب صریح ہے۔ یا تو خود اس نے یہ روایت گڑھی ہے یا کسی سے بلا تحقیق نقل کر دی ہے۔ اور اس کذب بیانی کی تہ میں کوئی سیاسی مقصد تھا۔ بعد میں لوگ بلا تحقیق اس کو نقل کرتے رہے۔ مگر آج جب کہ علم و تحقیق کی روشنی میں اس روایت کے اصلی خط و خال سامنے آگئے ہیں اس کو قبول کرنا انتہائی جہل و سفاہت ہے۔

آخر میں ہم اپنے دعوی کی تائید میں عصر جدید کے بعض مشہور مغربی مورخین کی رائیں درج کرتے ہیں۔ مسلمان مورخین کی رایوں سے اس لئے اعراض کرتے ہیں کہ ان پر جماعتی جنبہ داری کی بدگمانی کی جا سکتی ہے۔

مشہور مورخ لوکلیر نے فرانس کے مجلہ علمیہ میں ایک جگہ لکھا تھا۔

"عربوں کے مصر فتح کرنے کے وقت کتبخانہ اسکندریہ کا وجود ہی نہیں تھا۔ پس اس کے جلانے کا الزام عربوں پر عاید کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔"

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے۔

"ابو الفرج ملطی نے کتبخانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کی نسبت جو عربوں کی طرف کی ہے یہ محض افترا پردازی اور بہتان ہے۔ عربوں کی فتح سے بہت پہلے کتبخانے پر جو آفتیں اور تباہیاں

پے بہ پے نازل ہوتی رہیں۔ ان کے بعد کوئی قابل لحاظ چیز اس میں باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔ اور کوئی چیز رہ گئی تھی تو ۳۸۹ء میں پادری تھیافلس نے شہنشاہ تھیوڈوسیس کے حکم سے اس کو بھی جلا ڈالا تھا"

فرنچ انسائیکلوپیڈیا میں عمرو بن العاص رضؓ کے تذکرہ کے ضمن میں ہے۔

"عمرو بن العاص رضؓ بہت ہی مہذب اور عقلمند آدمی تھے۔ ان کی طرف یہ بات بالکل جھوٹ نسبت کیجاتی ہے کہ انھوں نے کتبخانہ اسکندریہ کو جلا دیا۔ ان سے بہت پہلے وہ مسیحیوں کی دست برد کے نذر ہو چکا ہے۔"

اسی انسائیکلوپیڈیا میں اسکندریہ کے تذکرہ کے سلسلہ میں مشہور مورخ ڈوٹامبل کے قلم سے یہ عبارت ہے۔

"۴۸ ق م میں جب یولیوس قیصر نے اہل اسکندریہ کے بیڑے میں، جو اس وقت بندرگاہ پر لنگر انداز تھا، آگ لگائی، تو کتبخانہ اسکندریہ بھی اسی آگ کی نذر ہو گیا۔"

ڈاکٹر گستاولی بان اپنی کتاب "تمدن عرب" میں لکھتا ہے۔

"کتبخانہ اسکندریہ کے جلانے کا الزام عمرؓ پر لگایا جاتا ہے۔ اس کی بابت میں اسی قدر کہونگا کہ اس قسم کا وحشیانہ فعل عربوں کے اوضاع وعادات کے اسقدر خلاف تھا کہ تعجب ہوتا ہے کہ اس قسم کی مہمل کہانی اتنے دنوں تک رائج رہے اور قبول کیجائے، ہمارے زمانہ میں اس واقعہ کی تردید ایسے عمدہ طور پر ہو گئی ہے کہ اس سے زیادہ بحث کی ضرورت نہیں، نہایت آسانی کے ساتھ اور بہت صاف اور صریح حوالوں کے ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے کہ عربوں کی فتح سے بہت پہلے خود عیسائیوں نے اسکندریہ کے بت پرستوں کے کتبخانہ کو اسی اہتمام کے ساتھ برباد کر دیا تھا جس اہتمام کے ساتھ انھوں نے ان کی مورتیں توڑ ڈالی تھیں۔ اور اسی وجہ سے عربوں کے زمانہ میں کتابیں باقی ہی نہ تھیں جنھیں جلائی جاتیں"

مشہور انگریز مورخ مسٹر الفرڈ بٹلر نے اپنی تصنیف "فتح العرب لمصر" میں، کتبخانہ اسکندریہ سے متعلق ایک لمبی چوڑی بحث لکھی ہے۔ اس کا آخری حصہ یہ ہے۔

"اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ عربوں کے اسکندریہ فتح کرنے کے وقت کتبخانہ اسکندریہ موجود تھا

جب بھی یہ قیاس میں نہیں آسکتا کہ اس کو عربوں نے برباد کیا ہو کیونکہ عرب فتح کرنیکے بعد پورے گیارہ مہینے کے بعد اسکندریہ میں داخل ہوئے تھے اور اس صلحنامہ کی رو سے جو عمرو بن العاصؓ اور رومیوں کے درمیان طے پایا تھا، رومیوں کو یہ حق حاصل تھا کہ اس مدت میں وہ جب چاہیں شہر چھوڑ کر چلے جائیں اور اپنے ساتھ جتنی چیزیں لیجانا چاہیں لے جائیں۔ اس پوری مدت تک تمام بحری راستے روم سے لیکر قسطنطنیہ وغیرہ تک بالکل کھلے ہوئے تھے۔ اگر اس وقت کتبخانہ موجود تھا تو ضرور ہے کہ رومیوں نے اس مدت میں کتابیں منتقل کر دی ہوں گی۔ اس لئے کہ علوم و معارف کا اتنا بیش بہا ذخیرہ وہ آسانی سے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔

عربوں نے اپنی فتوحات سے فارغ ہونے کے بعد قدیم کتابوں کو جو ان کو مل سکیں جمع کرایا۔ اور اکثر کتابوں کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا۔ درحقیقت ایسا کر کے انھوں نے ایسی مثال قائم کر دی جو موجودہ دور کے فاتحین کے لئے لائق تقلید بن سکتی ہے۔ پھر ان عربوں کے بارہ میں یہ کہہ دینا آسان نہیں کہ وہ اتنے وحشی تھے کہ علوم و معارف کے خزانے کے برباد کر دینے میں انھیں کوئی جھجک نہ ہو۔"

ان دلائل کے بیان سے ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا!

(تلخیص)

موعظۂ حسنہ

بنیادی رذائل

از جناب مولوی عزیز الرحمن صاحب اصلاحی

یہ مضمون عہد حاضر کے مشہور ماہر اخلاقیات (Edovard charpentiar) کی ایک تازہ تصنیف سے ماخوذ ہے۔ اور ہم نے اسکو الہلال مصر سے اقتباس کیا ہے (عزیز)

عہد حاضر کا انسان اپنی عقل کی ترقی و تربیت میں بڑی سرگرمی سے مشغول ہے۔ علوم کا زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل کر لینے کے لئے تگ و دو کر رہا ہے، لیکن روحانی تربیت و اصلاح سے نہ اسے کوئی دلچسپی ہے۔ اور نہ اس راہ میں کوئی ذوق بادیہ پیمائی۔

عقلی تربیت میں نفع ہے۔ دولت جمع ہوتی ہے۔ سماج کو مادی قوت پہنچتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ بڑی بڑی خواہشوں کی تکمیل کی راہ باز ہوتی ہے اس لئے اس کی طرف لوگوں کا رجحان ہے۔ روحانی ترقی اس قسم کے مادی منافع سے منزہ ہے۔ اس کی تمام ترقیاں خود اسی کے اندر پوشیدہ ہیں پس ایسے نادیدہ معشوق کے عشق میں کون عمر کھپائے!

عہد حاضر نے دلوں میں مادی منافع کیلئے کشش کی ایک آگ اس طرح مشتعل کر دی ہے کہ روحانی ترقی کے تمام ولولے دب گئے ہیں اور عقل و جذبات کے درمیان ایسی پھوٹ پڑ گئی ہے کہ وہ ذہنی وحدت بالکل پارہ پارہ ہو گئی ہے۔ جو انسان کے اٹھان کیلئے اصلی نیو تھی۔

موجودہ صنعتی تہذیب نے تعیش کے سامانوں کو پھیلایا۔ اور ان مصنوعات کو رواج ہوا۔

اور علم کی فرمانروائی عالمگیر ہوئی۔ اس وقت سے انسان کی طبیعت پر نفع پرستی غالب ہو گئی ہے۔ مذہبی ایمان رخصت ہو گیا ہے۔ اب علم ہر شخص کا معبود ہے۔ نفع قبلہ و کعبہ ہے اور مصلحت اوڑھنا بچھونا۔

لوگوں کے جذبات خراب ہو گئے ہیں، مذاق بگڑ گئے ہیں اور دل مردہ ہو گئے ہیں۔ مصلحین کو یہ خیال ہے کہ آرٹ مذہب کا قائم مقام ہو سکتا ہے۔ اور فنی تہذیب، جو حسن، صداقت اور نیکی کے عناصر سے مرکب ہے۔ تہذیب نفس اور اصلاح روح کے لئے بھی بالکل کافی ہے۔

لیکن ہمارے آرٹ پر خود اس وقت شیطان کا قبضہ ہے۔ جس سے وہ نہایت پست اور رذیل ہو گیا ہے۔ وہ ہماری عقل اور دل کے لئے کوئی بلند نمونہ پیش کرنے کے بجائے، صرف حسن ظاہر کی عبادت اور پرستش میں محدود ہے۔

اس چیز نے ہمارے موجودہ مصلحین کی خام خیالی بالکل واضح کر دی ہے اور یہ بات روشن ہو گئی کہ انسان کی ترقی جو عقل کی راہ سے ہوتی ہے اس ترقی سے بالکل مختلف ہے جو جذبات و عواطف کی رہنمائی سے ہوتی ہے۔

عقل انسانی اور جذبات انسانی کے درمیان اعتدال پیدا کرنے کی کیا صورت ہے؟ اور انسان کے فکر و عمل کو ہم آہنگ کرنے کے لئے کیا تدبیر اختیار کی جا سکتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس مقصد کیلئے ضروری ہے کہ ان بنیادی رذائل کا استیصال کیا جائے جو جذبات کی صحیح نشو و نما میں بالکل اسی طرح رکاوٹ پیدا کرتے ہیں جس طرح تعصب اور ہٹ دھرمی عقلی ترقی میں۔

اگر حکومتیں نفسی رذائل کی تباہ کاریوں کو اچھی طرح سمجھ جائیں تو ماہرین تربیت کو اس پر غور و بحث کی دعوت دیتیں۔ ان سے اس موضوع پر چھوٹی چھوٹی عام فہم کتابیں لکھوا کر طلبہ میں تقسیم کرتیں۔ ان کو مدرسوں کے نصابوں میں لازمی جزو کی حیثیت سے داخل کرتیں۔

ہم ذیل میں بالاختصار ان بنیادی رذائل کو بیان کرتے ہیں جو ہر انسان کے اندر خواہ وہ

علم وفن کے کتنی ہی بلند مرتبہ پر پہنچ گیا ہو، چھپے ہوئے ہیں اور جن کی سرکشی وبغاوت سے اسے اکثر شکوہ سنج ہونا پڑتا ہے۔

حرص حرص فضیلت ہے، لیکن بخل بدترین رذالت۔

حریص سمجھدار، مدبر، اور صاحب عزم ہوتا ہے۔ بخیل، ذلیل، دنی الطبع اور بندۂ زر ہوتا ہے۔ وہ دولت جمع کرنیکے خبط میں عقل وجذبات کی تمام بہترین قوتیں برباد کر دیتا ہے۔

بخیل کسی ضرورت کے رفع کرنے کے لئے روپیہ جمع نہیں کرتا۔ بلکہ جمع کرنے کے لئے جمع کرتا ہے۔ وہ ایک ایک روپیہ گنتا ہے، چھپا چھپا کر رکھتا ہے، دوسروں کی نگاہوں سے بچاتا ہے کہ مبادا کسی کی نظر پڑ جائے۔

ایک مرد اپنی بیوی کے معاملہ میں جتنا غیور ہوتا ہے، بخیل اپنی دولت کے باب میں اس سے زیادہ غیور ہوتا ہے۔ وہ فقر وتنگ دستی کی تمام مصیبتیں جھیلتا ہے لیکن روپیہ جمع کرتا ہے۔ اسے خوب معلوم ہے کہ اس کی دولت اس کے کام نہ آئے گی، اس کے بعد وہ ورثہ میں تقسیم ہو جائے گی۔ تاہم اضافہ کی سعی اور حفاظت کی سرگرمی میں اس سے کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ وہی مجنونانہ خود فراموشی باقی رہتی ہے۔ وہ اس راہ میں خونخوار بھیڑیوں کی طرح دوڑتا ہے۔ اگر اس کو شبہ بھی ہو جائے کہ کوئی اس کی دولت کی فکر میں اس کے پاس آیا ہے تو اس کو بے دھڑک پھاڑ کھائے۔ وہ اپنے دشمن سے انگیز کر سکتا ہے مگر اپنی دولت کے طالب کو ایک لمحہ کے لئے معاف نہیں کر سکتا۔

مولیر نے اپنے ڈرامہ میں بخیل کی ایسی بھیانک تصویر کھینچی ہے کہ اس کو دیکھکر آدمی ڈر جائے۔

بخل کی رذالت سے اور دوسری رذالتیں بھی پیدا ہوتی ہیں جو .... اس سے کم ذلیل وخطرناک نہیں ہیں۔ بخیل ہر اس عمدہ عادت، فیاضانہ جذبہ اور شریفانہ عمل کا دشمن ہوتا ہے جو قوی کو انکار ذات پر ابھارتا ہے۔ یہ وسیع دنیا باہمہ وسعت اس کی نظروں میں بس ایک نقطے کے

اندر سمٹ جاتی ہے، نہ وہ اس دائرہ سے کبھی قدم باہر نکالتا اور نہ، خواہ کتنی ہی اعتدال کے ساتھ سہی، اس دنیا کی لذتوں سے فائدہ اٹھاتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ بخیل جیتا تو ہے، لیکن بالکل مردہ! اس کی نظروں میں زندگی نہایت گھٹائی ہوئی چیز ہوتی ہے۔ وہ سمٹ سمٹا کر بس ایک سلبی لذت کے دائرہ میں بند ہو جاتی ہے۔ جس سے نہ کوئی فائدہ نہ جس کی کوئی ضرورت!

لیکن بخیل کو قائل کرنے کے لئے اور اس کی غلطی سوجھانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اسکو نہایت اچھے انداز سے سمجھائیں۔ مال سے اس کو جو عشق ہے اس کی قدر کریں اور پھر اس کو بتائیں کہ زندگی کی لذتوں سے فائدہ اٹھانا، عمدہ کاموں میں دولت کو خرچ کرنا اور خانگی وقومی فرائض کو ادا کرنا، ایسی باتیں ہیں جو حرص اور حفاظت دولت کی خواہش کے ساتھ بھی نہایت حسن وخوبی کے ساتھ پوری ہو سکتی ہیں۔ بغیر اس کے کہ اس کے اس اندوختہ کو جو اس نے برسوں کی محنت شاقہ کے بعد جمع کیا ہے، کوئی نقصان پہنچے وہ زندگی کی قدر وقیمت پہچان سکتا ہے۔ اور آدمیوں کی صف میں زندگی بسر کر سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اس کے نفس کی تہذیب وتربیت اور اس کی عقلی سطح کے بلند کرنے کی کوشش کی جائے اور ان تمام مصیبتوں کی طرف توجہ دلائی جائے جو اس کے بخل کی وجہ سے اس کے قریبوں اور متعلقین کو پہنچ رہی ہیں۔

غصہ انسان اکثر اپنا حق اس وقت ضائع کر دیتا ہے جب اس پر غصہ غالب آتا ہے۔ جلد غصہ ہو جانا، عصبی کمزوری، کند ذہنی اور نفس پرستی کی دلیل ہے۔ اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ بردبار ہمیشہ فائدہ میں رہتا ہے۔ اور سریع الغضب خسارہ میں۔ کیونکہ عموماً غصہ ور کا غصہ اس شخص کی توہین کا باعث خیال کیا جاتا ہے جس سے وہ بات کر رہا ہے اور بردباری

گفتگو اخلاق اور عقلی برتری کی حامل خیال کی جاتی ہے۔ خواہ اسمیں مکروفریب کے کتنے ہی داؤ پیچ چھپے ہوئے ہوں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تمھارا کوئی محبوب دوست تم سے کوئی بات کہتا ہے، اس کا مقصد سراسر تمھاری خیر خواہی ہوتا ہے۔ لیکن بیچ میں بلا کسی وجہ کے وہ غصہ ہو جاتا ہے، اس وقت اپنی خواہش کے بالکل خلاف، تم یہ محسوس کرتے ہو کہ تمھارے دل میں اس سے نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ برعکس اس کے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تمھارا دشمن تم سے کوئی بات کرتا ہے، اس کی گفتگو میں سنجیدگی اور متانت ہوتی ہے اس وقت تم محسوس کرتے ہو کہ جیسے اس کے لئے تمھارے دل میں محبت کی ایک گدگدی سی پیدا ہو گئی ہے اور تم کو اس عجیب احساس پر حیرت ہوتی ہے۔

غصہ ور اپنے اور اپنے ساتھ دوسروں کے فوائد کا دشمن ہوتا ہے۔ اور بردبار بقدر اس کے غصہ کے اس سے فائدہ اٹھاتا ہے اور پھر ایک مخفی استہزا یا ایک لطیف تبسم کیساتھ اسکو رخصت کر دیتا ہے۔

جو لوگ سریع الاشتعال ہوتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ اپنے حق کو ضائع کر دیتے ہیں۔ اور اپنے احباب اور دوستوں کو کھو دیتے ہیں۔ بلکہ لوگوں کی نظروں میں اپنا وقار بھی کھو دیتے ہیں۔ غصہ کا ہیجان انسان کے ذہنی معیار کو پست اور اس کے چہرے کو مسخ کر کے لوگوں کی نگاہوں میں اسکو ایک مضحکہ بنا دیتا ہے۔ لوگ اس پر حقارت سے ہنستے اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔

غصہ کا علاج یہ ہے کہ پہلے اعصاب، معدہ، اور بدن کی اصلاح کی جائے۔ اس کے بعد ضبط نفس کی مشق کے ذریعہ غصہ پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ جذبات اور ان ہیجانات کو روکا جائے جن کو حواس ابھارتے ہیں اور بغیر کافی سوچے ہوئے جھٹ زبان پر آجاتے ہیں۔

والٹیر جب کبھی محسوس کرتا کہ غصے سے مغلوب ہو رہا ہے تو تھوڑی دیر تک کے لئے سر جھکا لیتا اور ہونٹوں کو چباتا رہتا۔ پھر جب مخاطب کی طرف متوجہ ہوتا تو مسکراتا ہوا۔

نپولین کو جب غصہ آتا تو پورے کمرے کا بار بار چکر لگاتا اور کھانستا یہانتک کہ طبیعت کو سکون ہو جاتا۔

جان جاک روسو کو غصہ آتا تو دفعۃً غائب ہو جاتا، اور دیر تک اپنے باغ میں ٹہلتا یہاں تک جب اعصاب کو سکون ہو جاتا تو وہاں سے ہنستا ہوا واپس آتا اور ملنے والوں سے حسب معمول دلچسپی سے باتیں شروع کر دیتا۔

ہمارا خیال ہے کہ اس طرح کی ریاضتیں غصہ کا بہترین علاج ہیں۔

کسل

کسل انسانی طبیعت کی ایک عام برائی ہے۔ اس لئے کہ زندگی خوبصورت اور مختصر ہے اور اس کی نو بہ نو لذتیں آرام طلبی، تعیش اور بے عملی کی دعوت دیتی ہیں۔

کاہل بالعموم لذت پرست ہوتا ہے اگرچہ وہ لذت خیالی، وہمی اور ایک خواب ہی کی طرح کیوں نہ ہو۔ وہ ہر دم راحت کا طالب ہوتا ہے کیونکہ یہ خواہش بجائے خود لذیذ ہوتی ہے۔ وہ ہر دم حب ذات میں ڈوبا رہتا ہے۔ اس کا احساس اور عقل بالکل کمزور، شیخ چلی کے سے منصوبوں میں مست، موہوم امیدوں کے خیال میں مگن۔ اس کی زندگی ترک و تیاگ کی ایک مردنی ہوتی ہے۔ آج کا کام ہمیشہ کل پر ٹالتا ہے۔ عمل اور حرکت کے خیال سے اس طرح ڈرتا ہے جس طرح سگ گزیدہ پانی سے۔ اور اپنی ان تمام نالائقیوں کے جواز کے لئے ایک فلسفیانہ کلیہ بھی تراش لیتا ہے۔ کہ زندگی باطل چیز ہے۔ یہ محنت و کاوش کی سزاوار نہیں ہے۔

کاہل لیتا ہے لیکن دینا نہیں جانتا۔ وہ ہر چیز کا آرزومند ہوتا ہے، لیکن اپنے قویٰ کی شمہ برابر بھی طاقت خرچ کرنا نہیں چاہتا۔ آہستہ آہستہ جب کاہلی اس کے اندر راسخ ہو جاتی ہے تو اس کی آرزوئیں اور اس کی خواہشیں کمزور پڑ جاتی ہیں اور وہ زندگی کے بہت تھوڑے حصہ پر قانع ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ کسی کام کے لئے اس کو اپنے قویٰ اور اعصاب کو زحمت نہ دینی پڑے۔

جب یہ خرابیاں اس پر قابو حاصل کر لیتی ہیں، وہ ایک ناکارہ عضو بن کے رہ جاتا ہے۔

اپنے اہل وعیال اور سوسائٹی پر بار ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال اس طفیلی گھاس کی ہوتی ہے جو دوسرے پودوں کے رس کو چوس کر غذا حاصل کرتی ہے۔

اس مہلک بیماری پر نہایت سختی سے توجہ کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ یہ بیماری متعدی ہے۔ کاہل کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ اس کو اس وقت تک عیش کی لذت اور بیوقوفی کی بہشت کا پورا مزہ نہیں ملتا جب تک دوسروں کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹ نہیں لیتا اور اپنے جیسے نکھٹوؤں کا ایک پورا گھرانا نہیں بسا لیتا۔ وہ اپنے جراثیم تندرستوں میں پھیلاتا ہے تاکہ اپنی کاہلی کے لئے ایک سند جواز پیدا کرے۔ اور خوش گپ کے لئے ایک طائفہ قائم کرکے دل کے حوصلے نکالے۔

کاہل کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کو اپنے تن بدن کی صفائی کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ گویا تمام خوبیوں کے ساتھ اس میں گندگی کا احساس بھی مردہ ہو جاتا ہے۔ وہ غسل کو ایک زحمت لاطائل اور اضاعت وقت سمجھتا ہے۔

ہاں البتہ اس کا رسیا ہوتا ہے۔ اپنے قیمتی اوقات فضول گوئی، اور کمیروں پر نکتہ چینی میں برباد کرتا ہے۔ الغرض کاہلی ایک ایسی برائی ہے جو فرد کو جماعت سے بالکل علیحدہ کر دیتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ انسانیت سے بھی خارج ہو جاتا ہے۔ اس کے ذہن سے تبدیلی و ترقی کی استعداد سلب ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ دوسروں کی ترقی اور نشو ونما کی راہ میں روک بنجاتا ہے۔

کاہل کا بہترین علاج یہ ہے کہ اس کو کاہلی کے اسباب سے دور رکھا جائے۔ اس کو کمیروں کی جماعت میں شریک کیا جائے۔ بعض ورزشوں کی مشق کرائی جائے۔ اس کے سامنے ایک واضح راہ اور ایک متعین مقصد رکھا جائے۔ مشاہیر کے حالات کے مطالعہ کا شوق دلایا جائے۔ اور یہ دارو ئے شفا کافی مقدار میں پلایا جائے۔

حق یہ ہے کہ مشاہیر کی زندگی، جو صبر، اخلاق، برداشت اور قربانی کی حامل ہوتی ہے۔ عملی

سرگرمی اور ترقی کے لئے بہترین نمونہ بن سکتی ہے۔

زنا زنا محض برائی نہیں بلکہ ایک سنگین جرم بھی ہے۔ یوں کہیے کہ ایسی برائی ہے جو بغیر جرم کے وجود میں نہیں آتی۔

زنا کی برائی کس طرح پیدا ہوتی ہے اور اس کا سرچشمہ کیا ہے؟

شریر اور بدچلن آدمی وہ تمام باتیں کرنے کا شائق ہوتا ہے جو ناجائز ہوتی ہیں۔ اس کا بنیادی عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ ہر ممنوع چیز لذیذ ہے اور ناجائز لذت سے بڑھکر کوئی لذت نہیں۔ بس اس دنیا کی سیر ضروری ہے۔

یہی خیالی فتنہ جو ناجائز لذت کے اندر پوشیدہ ہے ایک فرد کو دوسرے مرد کی بیوی یا ایک عورت کو دوسری عورت کے شوہر کی جانب کھینچتا ہے اور ایک آزاد و خود باختہ نوجوان کو غیر شرعی طریقے سے جسمانی لذات سے متمتع ہونے پر آمادہ کرتا ہے۔

اس بری خواہش کے پیدا ہونے کے دو سبب بنیادی ہیں اور پھر ان سے بہت سے دوسرے ضمنی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں

(۱) سوء تربیت، جس سے بچپن ہی میں آوارگی، بدچلنی اور بے حیائی کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۲) شادی، اور اجتماعی و اقتصادی ذمہ داریوں سے آزاد رہنے کی خواہش۔

زانی دوسرے کے دسترخوان کے چٹخاروں سے شادکام ہونے کا آرزومند ہوتا ہے۔ خود اہتمام و انتظام کا دردسر خریدنا نہیں چاہتا۔ وہ اپنی جوانی، اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کو دفن کرنا نہیں پسند کرتا۔ اور یقیناً اس اعتبار سے وہ سوسائٹی کے اندر، ایک بدترین چور ہے۔

یہ برائی جب کسی انسان میں پیدا ہو جاتی ہے، تو اس کے جلو میں بہت سی برائیاں آتی ہیں۔ جھوٹ، نفاق، خبث، دغا، فضائل کی تحقیر، معاشرت کا استخفاف، قوانین کی نافرمانی، عام روح

مخالفت، سوسائٹی کے رسوم جنگ یہ تمام برائیاں زانی میں آپ سے آپ پیدا ہوجاتی ہیں۔

زنا کی آخری منزل اباحیت ہے۔ اور اباحیت مطلق انسانی کا دیباچہ، تباہی کا سرچشمہ اور موت کا دروازہ ہے۔ یہ سوسائٹی کے جسم کو بالکل کھوکھلا کرکے موت کی منزل تک پہنچا دیتی ہے۔

اسی لئے زانی ڈاکو اور قاتل کی طرح جماعت کا دشمن ہے۔ بلکہ وہ ڈاکو اور قاتل سے بھی زیادہ خطرناک عنصر ہے۔ قوم اور افراد کی زندگی پر وہ نہایت تباہ کن اثر ڈالتا ہے۔ وہ صرف لوگوں کی عزت و آبرو کو نہیں غارت کرتا۔ بلکہ ان کے شرف، انکی شہرت، انکے اطمینان ان کے نام و ران کے ادبی و اخلاقی جوہر ہر چیز پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔

اگر زانی کو معلوم ہو جائے کہ جائز لذت ناجائز لذت سے زیادہ پاکیزہ ہے تو ناجائز کی طرف نہ لپکے گا، اس برائی کی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ شادیوں میں آسانیاں پیدا کی جائیں اور اس راہ میں جو اقتصادی دشواریاں حائل ہیں ان کو دور کیا جائے۔

سچ یہ ہے کہ اس زمانہ میں شادی کی راہ میں بے شمار رکاوٹیں ہیں جن کی وجہ سے شادی کرنے والوں کو بے شمار زحمتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اگر ہم یہ رکاوٹیں دور کردیں، اور نوجوانوں کے دلوں میں صحیح جذبہ غیرت پیدا کرنے کی کوشش کریں تو امید ہے کہ اس برائی کے بہت سے امکانات کا سدباب ہو جائے گا۔ اور لوگ ایک غلط راہ پر چلکر ٹھوکریں کھانے کے بجائے نہایت آسانی سے فطرت اور انسانیت کی مقرر کی ہوئی سیدھی راہ پر آجائیں گے۔

حکمتِ غرب

مارکس ایریلیس کے خیالات

(۴)

از جناب مولوی میاں محمد عطا صاحب صدیقی ایم اے

ہپوکریٹز (Hippocrates) نے بہتوں کے دکھ درد کی دوا کی لیکن اپنے درد کی دوا نہ کرسکا اور چل بسا۔ اہل کالڈیہ اکثر لوگوں کی موت کی پیشنگوئی کیا کرتے تھے لیکن بالآخر ان کو بھی فیصلہ تقدیر کے آگے سرنگوں ہونا پڑا۔ سکندر اعظم، پامپی، سیزر نے بہت سے شہر خاک میں ملا دئے میدان کارزار میں لاکھوں سوار اور پیدل تہ تیغ کردیئے لیکن بالآخر وہ بھی چل بسے ہیراکلیٹس (Hiraclitus) جو آشوب عالم پر اکثر و بیشتر حکیمانہ خطبات دیا کرتا تھا، بادیدہ پرنم گہوارہ خس و خاشاک میں موت سے ہم آغوش ہوا۔ کیڑوں نے ڈیموکراٹس Democritus کو کھا ڈالا۔ دوسرے قسم کے کیڑوں نے سقراط کا خاتمہ کیا۔ ان سے کیا سبق ملتا ہے؟ تیرا سفر شروع ہوا۔ تو نے سمندر کو عبور کرلیا۔ اور ساحل پر پہنچ گیا۔ اب کشتی سے خشکی پر آنیکا وقت آگیا ہے۔ اگر تیری جائے پناہ ایک اور زندگی ہو نیوالی ہے تو بہت اچھا ہے۔ کیونکہ وہاں بھی خدا موجود ہوگا۔ اور اگر یہ نئی زندگی محض فراموشی ہوگی تو کچھ مضائقہ نہیں۔ تو مسرت و غم کے بارے تو اپنے کو سبکدوش کرسکے گا۔ اور اس دنیاوی کشتی کی غلامی سے تو آزاد ہو جائے گا؟ (یہ آقا (دنیا) اپنے غلام (انسان) سے کہیں زیادہ حقیر ہے کیونکہ غلام عقل و الوہیت کا حامل ہے۔ اور آقا فانی اور گمورہ لہو و لعب ہے۔

دوسروں کے پیچھے حیات مستعار کا بقیہ حصہ مت ضائع کر۔ اس کا صحیح مصرف صرف یہی ہے کہ تیرے سامنے صرف مفاد عامہ ہو۔ کسی کے عمل، علت عمل، اس کے بیان، خیال اور منصوبے اور ان تمام لغو خیالات کی وجہ سے، جو ہم کو اپنی باطنی شمع ہدایت کی رہنمائی سے محروم کر سکتے ہیں تجھکو محو حیرت نہیں ہونا چاہئے۔ اس طرح تو اپنے کار منصبی سے کیوں غافل ہو۔ اپنے سلسلہ خیالات کی بیکار کڑیوں، بالخصوص تجسس اور کینہ، و حسد سے احتراز کرنا تیرا فرض ہے۔ تیرا یہ بھی فرض ہے کہ تو اپنی تربیت نفس کا سلسلہ جاری رکھے تا آنکہ تیرے تمام خیالات ایسے مزین ہو جائیں کہ اگر کوئی تجھسے فوراً یہ سوال کر بیٹھے کہ تو کیا سوچ رہا ہے تو تو بے دھڑک بدون اخفاء راز اظہار حال کر دے۔ اور اس بات کو روز روشن کی طرح واضح کر دے کہ تو صرف سادگی اور لطف و کرم کا حامل ہے۔ جو زندہ مخلوق کے ایک فرد کے شایان شان ہے۔ تو ایک ایسا انسان ہے جو عام شوق لہو و لعب یا عیش و نشاط کے ولولوں کو پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتا۔ اور تو مباحثہ و مجادلہ، حسد اور رشک یا اسطرح کی ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے جن کے اقرار سے تجھے خجالت اٹھانی پڑے۔

ایسا انسان جو انتہائی فضیلت حاصل کرنے کے لئے اپنی جدوجہد کبھی ملتوی نہیں کرتا۔ وہ دیوتاؤں کا خادم اور پروہت ہوتا ہے[ف]۔ وہاں اپنی باطنی الوہیت کو بہتر مصرف میں لاتا ہے۔ یہ چیز اس کو لہو و لعب کی آلودگی سے پاک، درد دکھ کے بار سے سبکدوش، شوخی و گستاخی سے غیر متاثر اور برائیوں سے بے خبر و بے نیاز رکھتی ہے۔ اور اس کو اہم ترین مہم کا ایسا مرد میدان بنا دیتی ہے کہ وہ کبھی جذبات اور نفسانی سے مغلوب نہیں ہو سکتا۔ وہ قلبی مسرت کے ساتھ ہر مصلحت الٰہی

ف الاصلاح: تعجب ہے کہ عظیم الشان حکیم بھی دیوتاؤں کا ذکر اتنی بے تکلفی سے کرتا ہے اور افسوس ہے کہ یہ پستی تمام یونان کے تمام حکما کے اندر موجود ہے۔ افلاطون وغیرہ تک اس نجاست سے آلودہ نظر آتے ہیں۔ ومن لم یجعل اللہ لہ نوراً فما لہ من نور

کا خیر مقدم کرتا ہے۔ بجز اس صورت کے کہ کسی سخت مجبوری یا عافیت عامہ کا تقاضا ہو وہ کبھی دوسروں کے قول و عمل یا خیالات کو قابل توجہ نہیں سمجھتا۔ کیونکہ اس کو اپنے ہی فرض کی بجاآوری کی فکر سے فرصت نہیں ملتی۔ اس کی توجہ صرف اس جزء پر ہوتی ہے جو کل سے اس کے حصہ میں آتا ہے جن چیزوں کا تعلق اس سے ہوتا ہے وہ ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے اور نوشتہ تقدیر کی خوبی پر اپنے کو راضی رکھتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص کا نوشتہ تقدیر جو اس کے ساتھ دنیا میں لایا جاتا ہے وہ ایک جزء ہے جو کل کی تکمیل کا باعث ہوتا ہے۔

ایسا شخص یہ بھی یاد رکھتا ہے کہ تمام ذی عقل مخلوق (عالم) ایک رشتہ نسبی میں منسلک ہے اور یہ کہ اگرچہ انسانی زندگی کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ انسان تمام بنی نوع انسان کی باتوں کا لحاظ رکھے تاہم وہ اپنا فرض صرف یہ سمجھتا ہے کہ سب کی نہیں بلکہ صرف ایسے لوگوں رائے قبول کرے جن کی زندگی فطرت سے ہم آہنگ ہے۔ اور ایسا شخص ان لوگوں کی سیرت اور اطوار سے ہمیشہ چوکنا رہتا ہے جنکا طرز زندگی اس کے خلاف ہوتا ہے، وہ ان کے ان کھلے چھپے اعمال سے بھی ہوشیار رہتا ہے جو خلوت یا جلوت میں انجام پاتے ہیں، اور ان کے ان ہم مشرب رفقاء سے بھی جو ان کے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہوتے ہیں اس اصول کی روشنی میں وہ اپنا وقت ان لوگوں کی تعریف و تحسین میں ضائع نہیں کرتا جو خود اپنے ہی کو مطمئن نہیں کر سکے۔

تیرا عمل اضطراری، خود غرضانہ، غور و فکر سے خالی اور مذبذب نہ ہونا چاہئے۔ اپنے خیالات کو شوکت الفاظ سے مزین و مرصع کرنے کی کوشش مت کر۔ تو صاف گو اور صاف معاملہ بن جا۔ اس بات کی فکر رکھ کہ تیرا باطنی وصف یزدانی ایک ایسے جری انسان کا نگراں و

سرپرست ہے، جو ضعیف العمر و مدبر ہے۔ روم کا باشندہ اور تاجدار ہے اور وہ ایک سپاہی کی مانند اپنی جگہ پر کار منصبی میں مشغول اور واپسی کے بگل کی آواز پر کان لگائے بالکل مستعد و منتظر ہے کہ اس آواز کے سنتے ہی پیچھے قدم ہٹائے۔ اس کو کسی شخص کی حلف یا شہادت کی ضرورت نہیں ہے۔ قصہ مختصر خود اپنی اصلاح کر درست ہو۔ دوسروں کی اصلاح کی فکر میں مت گھل۔

تجھے انسان کی زندگی میں کوئی ایسی شے نظر آتی ہے جو صداقت، انصاف، ترک منہیات، مردانہ جرأت، الغرض ایک ایسے پرسکون دماغ سے افضل تر ہے۔ جس کے باعث تو عین عقل سلیم کے مطابق عمل پیرا ہو سکتا ہے؟ اور وہ دماغ بغیر تیری مرضی یا رضا کے تیرے لئے مقدر ہو چکا ہے۔ تجھکو اگر اس سے افضل کچھ اور نظر نہیں آتا تو میں کہتا ہوں کہ تو ان چیزوں سے بہتر کچھ اور نہیں دیکھ سکتا۔ تو بدل و جان ان کی طرف رجوع ہو اور وہ جو افضل ترین ہے اس سے تو بدرجہ اتم محظوظ ہو۔

اگر تجھکو کوئی اور شے اس شمع یزدانی سے بہتر نظر نہیں آتی جو تیرے سینہ میں روشن ہے۔ جس کی کارفرمائی تیری تمام تحریکات طبعی پر جاری ہے، جو تیرے ہر خیال کا محاسبہ کرتی ہے، جس نے تجھکو بہ الفاظ سقراط نفس کے ہر آزار سے رہا کیا ہے، جس نے خدا کی مکمل اطاعت قبول کی ہے، اور بنی نوع انسان کی نگرانی و نگہداشت کا بار اٹھایا ہے ——— اگر ایسا نہیں ہے اور سب کچھ اس وصف یزدانی کے سامنے صریحاً حقیر و پست ہے تو تو کسی ایسی چیز کو اپنے قریب نہ آنے دے جس کی طرف ایک مرتبہ بھی مائل و منحرف ہونے سے تو پھر اس نیکی کو جو تیری اور صرف تیری ہے اپنا خراج اطاعت و عقیدت ہمہ تن نہ پیش کر سکے گا۔ کیونکہ خدا نے منع فرمایا ہے کہ ہر وہ شے جو ناجنس و بیگانہ ہے چاہے وہ اکثریت کی مدح و تحسین ہو یا عہدہ و منصب کی لالچ، دولت و ثروت کی طمع ہو یا تعیشات نفسانی کی گرائی، اس کو متحداً شہری فلاح

بہبود یا اس مفاد کے خلاف صف آرا ہونے دیا جائے، جو عین عقل کے مطابق ہے۔ کیونکہ اگرچہ یہ چیزیں ذرا دیر کے لئے اپنے کو بہتر نمونہ کے مطابق بنا لیتی ہیں لیکن فوراً ہی وہ ہم پر مستولی اور غالب ہو جاتی ہیں اور ہم ان کے دھارے کے ساتھ بہہ جاتے ہیں۔ بہتر شے کا انتخاب پورے دل و جان اور آزادی سے کر اور اس پر قائم و مضبوط رہو۔ کسی شخص کا قول ہے کہ "بہتر شے مفید ہوتی ہے"۔ اگر یہ مقولہ تیرے عقلی وجود کے لئے مفید ہے تو اس کو مضبوط پکڑ لیکن اگر اس کا مقصد تیری اپنی حیوانی فطرت کی تائید ہے تو اس کو ترک کر اور بدون رعونت اپنے فیصلہ پر قائم رہ اور صرف اس بات کا خیال رکھ کہ تیرا فیصلہ صحیح ثبوت پر مبنی ہے۔

(باقی)

ایک عمدہ عربی ریڈر

امثال آصف الحکیم

از

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی

ہم لوگوں کو عربی کے ابتدائی درجوں میں پڑھانے کے لئے عرصہ سے ایک عمدہ عربی ریڈر کی تلاش تھی مگر کوئی مناسب ریڈر نہ ملی مصر کے مدارس میں جو ریڈریں پڑھائی جاتی ہیں وہ منگوائیں مگر یہاں کے نصاب سے ان کا میل نہ ہوا۔ اتفاق سے مولانا کے کاغذات میں دیکھا گیا تو ایک نہایت عمدہ عربی ریڈر مل گئی جو انھوں نے نصاب تعلیم کے لئے تیار کی تھی۔ یہ ریڈر دائرہ نے چھاپ کر شائع کر دی ہے۔ عربی مدارس کے ابتدائی درجوں کیلئے بہترین چیز ہے۔ اساتذہ و مہتممین دیکھکر انشاءاللہ اس کو پسند کریں گے، مدرسۃ الاصلاح نے اپنے نصاب کے لئے اس کو پسند کر لیا ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب، کاغذ عمدہ

قیمت: ۸ /

منیجر

ادبیات

غزل

از جناب فراق گورکھپوری

یہ کرشمے حسنِ بتاں کے ہیں کہ یہ شعلے قلبِ تپاں کے ہیں
کہ فریبِ وہم و گماں کے ہیں یہ فراق جلوے کہاں کے ہیں

جو پھول سوزِ نہاں کے ہیں انھیں کیا بتائیں کہاں کے ہیں
نہ یہ طور برقِ تپاں کے ہیں نہ فروغِ حسنِ تپاں کے ہیں

کچھ شعلے لپکے ہیں طور سے کچھ مہر صبحِ نشور سے
کچھ برقِ حسنِ غیور سے یہ کرشمے سوزِ نہاں کے ہیں

یہ نہ کہہ کہ صبر محال ہے، غمِ عشق خواب و خیال ہو
جو بچھڑ کے ان سے یہ حال ہو آ دل دکھا کے کہاں کے ہیں

یہ وصال و ہجر کی شام کیا، یہ تڑپ یہ جذبۂ خام کیا
ہمیں حسن و عشق سے کام کیا کہ ہم اپنے جذبِ نہاں کے ہیں

نہ ہے اعتماد جہان پر، نہ عدم کی سمت اٹھی نظر
ترے گم شدہ، ترے بے خبر، نہ یہاں کے ہیں نہ وہاں کے ہیں

جو ترے دیار میں آ رہے، ارے تجھ سے کیسے جدا رہے
تجھے کچھ تو اپنا پتا رہے، یہ نہ پوچھ ہم سے کہاں کے ہیں

مرے شعر نغمۂ ساز ہیں، مرے دکھتے دل کے یہ راز ہیں
جو نوائے سوز و گداز ہیں نہ زبان نہ طرزِ بیاں کے ہیں

کھلے رازِ دل تو یہ دیکھنا کہ دہن سے شعلہ بھڑک اٹھا
یہ نہ پوچھ پھوٹ کے ہوں گے کیا جو فراق چھالے زباں کے ہیں

غزل

از

حضرت دل شاہجہانپوری

عبث ہے پندِ ناصح، دیکھ لے اس آفتِ جاں کو
انھیں نظروں سے پھر دیکھے مرے چاکِ گریباں کو

کیا اشکوں نے نورانی ہماری فردِ عصیاں کو
مبارک ہو یہ پیغامِ کرم چشمِ پشیماں کو

سرِ طور ایک برقِ حسن لہراتی نظر آئی
ذرا شوخی سے جھٹکا تھا کسی نے اپنے داماں کو

اسیرو، ہے انھیں تاروں میں مضمر رازِ آزادی
جو ہمت ہو تو وسعت اور دو چاکِ گریباں کو

نہ کھینچ اے چارہ گر مجروحِ دل سے تیر کے ٹکڑے
سجایا ہے بڑی کاوش سے ہم نے اس گلستاں کو

جنوں کے ولولے پابند ہو کر دب نہیں سکتے
کوئی سمجھے تو کیا سمجھے جو سمجھا ہم نے زنداں کو

مجھے منظور وہ نازِ تبسم اشکِ شبنم پر
مگر دیکھا نہیں جاتا تری چشمِ پشیماں کو

حدِ ادراک سے اب بڑھ چلی ہے چاک دامانی
مجھے رسوا نہ کر ناصح سنبھال اپنے گریباں کو

زبانِ نازکش مجرم سلاسل کی صدا مجرم
مصیبت ہے کہاں تک جھیلئے اس قیدِ زنداں کو

تعین کی اٹھیں قیدیں تو جلوے خود پکار اٹھے
یہاں سے کیجئے ہشیار اپنی چشمِ حیراں کو

بگولے دشت کے ہر ہر قدم پر گھیر لیتے ہیں
مری وارفتگی اب تک لئے پھرتی ہے زنداں کو

محبت موج ہے دریا، محبت بحر ہے ساحل
کیا ضبط ایک دل نے ہر تلاطم خیز طوفاں کو

محبت راز تھی رسوا ہوائی جو اشکِ خوں بن کر
چھپانا تھا بہت گہرائیوں میں نوکِ پیکاں کو

جنوں میں حضرت دل قیدِ تنہائی سے کیا حاصل
مقید پہلے کرنا تھا خیالاتِ پریشاں کو

منشی پریم چند کی نئی کتاب

واردات

منشی پریم چند آنجہانی کے ان افسانوں کا مجموعہ ہے، جو مختلف رسائل میں منتشر تھے، افسانے کیا ہیں ہماری معاشرت کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں اور اس کا اندازہ آپ کو ان افسانوں کے عنوانات سے ہو جائے گا۔

شکوہ شکایت، معصوم بچہ، بدنصیب ماں، شانتی، روشنی، مالکن، نئی بیوی، گلی ڈنڈا، سوانگ، انصاف کی پولیس، غم نداری، ہفت کرم، دشمن، قاتل کی ماں، نہایت عمدہ گیٹ اپ مجلد عہ

مضامین رشید

پروفیسر رشید احمد صدیقی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اردو کے چند منتخب لکھنے والوں میں ہیں خصوصاً انکی مزاحیہ نگاری ملک کے ہر طبقہ میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر چکی ہے، آپ کو یہ سنکر خوشی ہوگی کہ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ ستمبر ۱۹۳۸ء میں مکتبہ نے شائع کیا ہے، یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت سے سینچی ہوئی کشت زعفران، تروتازہ، شاداب، فرحت بخش، کتابت و طباعت اور ظاہری خوشنمائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد عہ

بچوں کی نئی کتابیں

لال مرغی ۲ر، عید ۳ر، عتاب ۴ر، انعامی مقابلہ ۵ر، دنیا کے بچے ۲ر، کائنات ۴ر، جگنو کی ملی، پوری کڑاھائی سے نکل گئی ۲ر۔

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ، دہلی، نئی دہلی، لاہور،

تفسیر سورۃ الفیل

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ الفیل کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کی بر فصل ایک مستقل کتاب ہے، واقعہ فیل کی اصل حقیقت اس کتاب کی اشاعت سے پہلے بالکل مجہول تھی، علامہ فراہی نے کلام عرب کی مدد سے واقعہ کی تمام تفصیلات فراہم کرکے تمام تاریخی غلطیوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ واقعہ ظہیر کو بھی عجائب پرستی نے بالکل دوسرا رنگ دیدیا تھا۔ مولانا نے اس واقعہ کے متعلق بھی عینی شاہدوں کی شہادتیں جمع کرکے اس کی اصل حقیقت کو آشکارا کر دی ہے اور اسی سلسلہ میں رمی جمرات اور حج کے دوسرے مراسم کے اسرار و حکم نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین، کاغذ عمدہ حجم ۱۱۳ صفحے۔ قیمت ۸ر

تفسیر سورۃ کافرون

اس میں ہجرت اور برأت کا اصلی فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ اور نبوت کے مراحل و مقامات کی توضیح اس قدر حکیمانہ انداز میں کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی بے شمار مشکلات آپ سے آپ حل ہوگئی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ عمدہ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۴۸ صفحے قیمت ۴ر

اسباق النحو حصہ اول و دوم

اردو زبان میں عربی صرف و نحو کے بہترین رسالے ہیں۔ قیمت حصہ اول ۵ حصہ دوم ۶ر

تحفۃ الاعراب

اردو زبان میں عربی نحو کے مسائل نہایت بہترین طریقہ سے بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۲ر

منیجر